اگست
اردو دنیا
Annual Subscription
Surface Mail Air Mail
Pakistan........Rs. 192....... 480
Nepal...........Rs. 300........588
Bangla Desh... Rs. 132........420
Rest of World. Rs. 300.........684
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، قطر میں کائنات فاؤنڈیشن قطر کے اراکین اور ہندوستانی شعرا کے ساتھ۔

نگرنگم جے پور کے زیر اہتمام منعقدہ ہند پاک مشاعرے میں مرحوم راہی شہابی کے مجموعۂ کلام ''ایک لمحہ'' کا اجرا کرتے ہوئے مشہور شاعر احمد فراز۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔10، شمارہ۔8، اگست 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 110 066
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 ,26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 5

زبان اور ادب

- اچھی اردو: روزمرّہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمٰن فاروقی 6
- شعر فراق کی تہذیبی قرأت .... قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی 7
- ساغر خیامی۔ قہقہوں کا سوداگر .... مخمور سعیدی 9
- مخدوم کی ایک پرکیف نظم۔ "چارہ گر" .... شمیم طارق 13
- محمود ایاز اور جدیدیت .... سرور الہدیٰ 16
- انتقام۔ (افسانہ) .... ف.س. اعجاز 22

ثقافت

- سنسار کے بازار میں .... ندا فاضلی 25
- چند بین الاقوامی تنظیمیں .... انور ادیب 27

ماحولیات، غذا اور صحت

- جنگلات کا تحفظ۔ وقت کی اہم ضرورت .... محمد خلیل 29
- پانی اور صحت .... جمال نصرت 31
- آم۔ ہندوستان کا قومی پھل .... ایس مقبول احمد 33

کیریئر

- اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ .... ذیشان فاطمہ 35
- C.A.T. کی تیاری کیسے کریں .... زبیر احمد بھاگلپوری 37

روبرو

- سیّد مصطفیٰ کمال سے گفتگو .... فیروز عالم 39

ہماری مطبوعات سے

- سلطان ابراہیم لودی .... محمد حبیب/خلیق احمد نظامی 44
- قانی کی شخصیت .... مغنی تبسم 49

اردو خبرنامہ .... ادارہ 55

تبصرہ و تعارف

- کلیات راجندر سنگھ بیدی .... ابوبکر عباد 70
- اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ .... ظفر احمد نظامی ....
- علاج بذریعۂ غذا .... عاقل زیاد ....
- ذہن جدید (سہ ماہی) .... جاوید رحمانی ....
- نگاہِ طائرانہ .... سیّد احمد شمیم ....
- قربت کی خوشبو .... ارشاد عالم ....

بچوں کا گوشہ

- سیر جم کاربیٹ ریز رو پارک کی .... رفعت سروش 76
- شارک مچھلیاں۔ ایک دلچسپ سمندری مخلوق .... عبدالعلیم قدوائی 79

آپ کی بات

■ نامی انصاری، 99/295، تالا روڈ، چمن گنج، کانپور-208001

''اردو دنیا'' کے جون کے شمارے میں اردو رسم الخط کے ضمن میں، محمد ہاشم قدوائی کے فرمودات بالکل درست ہیں۔ خاص کر آخر کے دو پیراگراف سے اختلاف ممکن ہی نہیں ہے تاہم اردو رسم الخط میں جو ایک بڑی خرابی ہے، اس کی طرف شاید ہی کبھی کسی نے کوئی اشارہ کیا ہو۔ وہ خرابی یہ ہے کہ ایک لفظ جس طرح لکھا جاتا ہے، اس کو کئی طرح سے پڑھنا ممکن ہے اور ایک عام قاری مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اس کو کس طرح پڑھے۔ خاص کر عربی فارسی یا مغربی زبانوں کے الفاظ جن کو اردو رسم الخط میں لکھا جاتا ہے، ان کو کس طرح پڑھا جائے۔ مثال کے طور پر مینا کو مِینا پڑھا جائے یا مَینا پڑھا جائے۔ کشور کو کِشور پڑھا جائے یا کَشور پڑھا جائے۔ ملک کو مَلَک، مِلک یا پھر مُلک پڑھا جائے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ای.ٹی.وی.، اردو کے نیوز ریڈر، غرض کو غَرَض، رقم کو رَقَم عَرَق کو عَرَق پڑھتے ہیں۔ میرے ایک شناسا سُکُم کو سَکَم بولتے تھے۔ دیوناگری رسم الخط میں یہ التباس نہیں ہوتا مینا کو मीना ہی لکھا جائے گا اور یہی پڑھا جائے گا، رَقَم کو रकम ہی لکھا جائے گا اور یہی پڑھا جائے گا رَقُم نہیں پڑھا جائے گا۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ زندگی بھر اردو پڑھنے بلکہ پڑھانے کے باوجود کسی لفظ کا غلط تلفظ اس طرح ذہن پر جم جاتا ہے کہ منہ سے غیر ارادتاً وہی غلط تلفظ نکل جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس دشواری کا کوئی حل نہیں ہے مگر اردو رسم الخط کی اس خامی کا اعتراف تو کرنا ہی پڑے گا۔

■ محمد حسین پرکار، 204، 'اے'، سمراٹ اپارٹمنٹ، فادر پیٹر پریرا روڈ، (سونا پور لین) آف، لال بہادر شاستری مارگ، کولا (مغربی)، ممبئی

''اردو دنیا'' کے ہر شمارے میں اردو اور اردو والوں سے متعلق مختلف موضوعات پر مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اردو کے دوسرے رسائل و جرائد سے بھی اچھے مضامین آپ اخذ کرکے شائع کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مضمون آپ کے ماہ جون کے شمارے میں جناب عبداللہ امتیاز احمد بعنوان ''گیان پیٹھ انعام پانے والی اردو شخصیات'' ہمارے سہ ماہی تحقیقی رسالے ''ہندوستانی زبان'' کے اپریل۔ جون 2008 کے شمارے سے اخذ کیا گیا ہے۔ میں آپ کی دوررس نگاہوں کی داد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ رسالہ ''اردو دنیا'' اسی آب و تاب سے شائع ہوتا رہے۔

اپریل 2008 کے ''اردو دنیا'' کے شمارے میں جناب محمد خلیل کا مضمون ''پروفیسر محمد شفیع: ایک معروف و ممتاز جغرافیہ داں'' پڑھ کر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی اور میرا یہ یقین اور بھی پختہ ہوگیا کہ ہر وہ شخص جو اپنے مضمون میں ماہر ہے، وہ اپنی عالمانہ بصیرت سے نہ صرف ملک و قوم بلکہ پورے کرۂ ارض کے لیے خوشحالی و کامرانی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ادب و فن اپنے طور پر فائدہ بخشتے ہیں تو دیگر علوم اپنے اپنے طریقے سے۔ اہل علم فروغ انسانی وسائل کے حصول کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انھیں بتائے ہوئے طریقوں سے حاصل کرنا حکومت اور متعلقہ افراد اور تنظیموں کا کام ہے۔

پروفیسر محمد شفیع جغرافیہ اور سائنس دونوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے علم کو اور اپنی مہارت کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ دوسروں کو مستفیض کیا اور اپنے دائرۂ خدمت کو بین الاقوامی وسعت عطا کی۔ جناب محمد خلیل جو خود ایک سائنس داں ہیں اور طویل عرصے تک سائنس کی دنیا کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں ان سے بہتر پروفیسر محمد شفیع کی شخصیت اور خدمات کو کون پیش کرسکتا تھا۔ میں انھیں اور ''اردو دنیا'' دونوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے اہل وطن زرعی پیداوار کے لیے پروفیسر محمد شفیع مرحوم کے بتائے ہوئے خطوط پر عمل کرکے وطن عزیز کو خوشحالی و کامرانی عطا کریں گے۔

■ محمد مسیح الحسن، سکریٹری اردو کونسل ہند، بھوجپور شاخ، تکی محلہ، آرہ، بہار

بہار میں ''اردو زبان و ادب کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ''اردو کونسل ہند'' کے بینر تلے شہر آرہ (بھوجپور) بہار کے ہمدردان اردو نے ایک تحریک کی داغ بیل ڈالی ہے۔ ہم گھر گھر جاکر لوگوں کو اس بات کے لیے آمادہ کررہے ہیں کہ وہ ہر روز اردو کا ایک اخبار خریدیں اور مہینے میں کم از کم اردو زبان کا ایک معیاری رسالہ بھی خریدیں۔ رسالہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھائیں۔ یہ جان کر آپ کو بے حد خوشی ہوگی کہ ہماری تحریک صد فیصد بارآور ہوئی ہے۔

14 اپریل 2008 کو اس ضلع کی نئی ضلع مجسٹریٹ محترمہ ایس این سفینہ، (آئی اے ایس) کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقعے پر بھی اردو زبان میں ایک بینر آویزاں کیا گیا کہ ''اردو کا اخبار خریدیں'' رسالہ خریدیں اور اردو کے لیے اردو میں سوچیں'' محترمہ کلکٹر صاحبہ کی خدمت میں مطالبہ بھی پیش کیا گیا کہ خط افلاس (B.P.L) سے نیچے اور خط افلاس سے اوپر (A.P.L) لوگوں کی فہرست کے علاوہ رائے دہندگان کی فہرست اردو زبان میں شائع کی

جائے۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ ضلعی دفتر کے سارے احکامات اور ہدایتیں اردو زبان میں بھی شائع کی جائیں کیونکہ اردو زبان ریاست بہار کی قانونی سرکاری زبان ہے، اور یہ مطالبہ حکومت کے سرکاری محکمے کے عین مطابق ہے۔ علاوہ ازیں ملکی محلہ آرہ، جو اقلیتوں کی کثیر آبادی والا علاقہ ہے یہاں لڑکیوں کے لیے کم از کم ایک اردو مڈل اور ہائی اسکول کا قیام کیا جائے۔

کلکٹر صاحب نے مطالبہ نامہ حاصل کرتے ہوئے مثبت اقدام کا وعدہ کیا۔ یہ اطلاع اس امید کے ساتھ آپ کو بھیجی جارہی ہے کہ اسے آپ ''اردو دنیا'' میں شائع کر کے ہماری تحریک کو تقویت دیں گے شاید اس سے ''اردو دنیا'' کے دیگر قارئین کو بھی تحریک ملے۔

■ **شاکل ادیب، 104/304/9/3، زیب منزل، مشیرہ آباد، حیدرآباد-49 (اے۔پی۔)**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت جون 2008 باصرہ نواز ہوا۔ ہر بار کی طرح اب کی بار بھی آپ کا اداریہ مختصر مگر جامع ہے۔ آپ نے اردو زبان کی ابتدا سے آج تک اس کی تہذیب، ثقافتی رنگارنگی، اس کے ادبی و شعری کارناموں اور اس کی اہم خصوصیات یعنی اس کی لسانی ہم آہنگی کے جو گن گنواتے ہیں وہ واقعی حقائق پر مبنی ہیں اور ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا مضمون بھی خوب ہے۔ انھوں نے تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کے اسباب کی جانب اشارہ بھی کیا ہے اور ان کے توازن کی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ جناب محمد علی جوہر کا مضمون ''تعلیم اور اخلاقی قدریں'' بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ سابق میں تعلیمی نصاب میں ''اخلاقیات'' بھی ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ ان دنوں اس کی عدم شمولیت نئی نسل کی اخلاقی بے راہ روی کا اہم سبب ہے۔ جناب ایم مبین صاحب نے بچوں کے ادب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان دنوں بچوں کے ادب کے رسائل تو نہیں کے برابر ہیں اور رسائل اور اخبارات میں بچوں کے صفحات کی اشاعت کا رواج بھی نہیں رہا۔ البتہ ادارہ ''اردو دنیا'' قابل تحسین ہے کہ اس نے وقت کی اہم ضرورت پر نظر رکھتے ہوئے ''اردو دنیا'' میں ہر ماہ ''بچوں کے گوشے'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ جناب اشفاق محمد خاں نے اردو کے عظیم ڈراما نگار حبیب تنویر کو دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کا طرز تحریر نہایت ہی دلچسپ ہے۔

■ **بھگوان داس اعجاز، ٹی-451، بلجیت نگر، نئی دہلی-8**

''اردو دنیا'' کا جون کا شمارہ بروقت ملا، مشکور ہوں۔ ورق گردانی کی تو کئی چیزوں نے متاثر کیا۔ ''روبرو'' میں عصمت چغتائی کے کنھیا لال نندن کی بات چیت ''جس کا ترجمہ آپ نے کیا'' اچھا لگا۔ عصمت چغتائی دھڑلے سے بات کرتی تھیں، وہ نڈر تھیں۔

ایک سہ روزہ سیمینار کا ذکر بھی ''ہماری بات'' میں آیا ہے جس کا موضوع ''جنگ آزادی میں بنگال اور بہار کا حصہ اور اردو زبان و ادب'' تھا، تو یاد آیا کافی عرصہ پہلے دو کتابیں میری نظر سے گزری تھیں، اردو میں ''جنگ آزادی میں بہار کا حصہ'' اور ہندی میں چھپی کتاب کا نام ''مہاتما گاندھی چمپارن میں'' شاید یہی تھا اور مصنف تھے بابو راجندر پرشاد۔

■ **محمد یعقوب اسلم، 15، B گمن پدور، وانم باڑی-635751**

''اردو دنیا'' کا جون کا شمارہ دیکھا۔ اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل، تعلیم کا گرتا معیار اور اس کے اسباب اور تعلیم اور اخلاقی قدریں، یہ مضامین بہت اچھے لگے۔ فاروقی صاحب کا کالم واقعی معلوماتی ہے۔ ''بچوں کا گوشہ'' میں زبیر احمد بھاگلپوری کی کہانی اچھی لگی۔

■ **محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد**

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' کے جون اور جولائی کے شمارے بروقت موصول ہوئے۔ جون کے شمارے میں ''ہماری بات'' تنقیدی شعور لیے ہوئے ہے۔ اس کے مطالعے سے اردو زبان و ادب کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ نیز مختلف ریاستوں میں اردو کے سماجی اور معاشرتی موقف پر روشنی پڑتی ہے۔ محمد ہاشم قدوائی نے اردو رسم الخط پر مختصر مگر بصیرت افروز مضمون لکھا ہے۔ محمد اختر صدیقی نے 1957 کے بعد اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل پر گفتگو کی ہے اور کئی اہم باتیں کہی ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے تعلیمی معیار و نظام میں گراوٹ پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے سیاست، والدین اور اساتذہ کو معیار کے تنزل کا ذمے دار گردانا ہے جو صحیح ہے۔ محمد علی جوہر کا مضمون ''تعلیم اور اخلاقی قدریں'' موثر ہے۔ موجودہ دور میں تعلیم تجارت بن گئی ہے۔ تعلیمی ادارے مادیت اور مادی جذبوں کو ابھار رہے ہیں۔ اگر تعلیمی نظام کا یہی حال رہا تو آئندہ سماج اخلاقی بحران کا شکار ہو جائے گا۔ تعلیمی نظام کو اخلاقیات سے مربوط کرنا ہوگا۔ جولائی کے شمارے میں ''آپ کی بات'' کالم میں رسالے سے متعلق مختلف مشاہیر کی آرا شامل ہیں جن میں تنقیدی شعور پایا جاتا ہے۔ ''ہماری بات'' میں ایک اہم مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مراعات و رعایت کے لیے قوم احتجاج اور تشدد پر اتر آتی ہے۔ حق تلفی اور ناانصافی ہوتی ہے تبھی ایسا ہوتا ہے لیکن جمہوریت میں پرامن طریقے ہی اختیار کرنے چاہئیں۔ عبدالباری مسعود نے مردم شماری 2007 کی لسانی رپورٹ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون لسانیاتی معلومات سے بھرپور

ہے اور ایس۔ایم۔رحمت اللہ نے "اردو زبان کے عصری تقاضے — مسائل اور حل" میں جامعیت کے ساتھ اردو کے موقف پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ اردو کی بقا و ترقی کے لیے تعلیمی اداروں اور سماج میں بیداری اور ایمانداری ہونی چاہیے۔ انھوں نے مسئلے کے تمام پہلوؤں کا عصری تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ رشید احمد رشید تراپ کے مضمون "نظم اور غزل کی تدریس" میں مختلف تعلیمی درجات میں نظم و غزل کی تدریس کیسے کی جائے اس پر اچھی روشنی ڈالی ہے اور مختلف شعری حوالوں سے اپنی بات کی وضاحت کی ہے۔ ویسے آج کل پی۔ایچ۔ڈی۔ تک صرف شعر کی تشریح کرنے کا کام ہو رہا ہے اصولوں کی تفہیم ندارد ہے۔ "ہندوستان کے لوک گیتوں میں 1857 کی جھلکیاں" دلچسپ مضمون ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے 1857 کی جنگ آزادی میں عوامی احساسات کیا تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اور صحت کے تحت جو مضامین شامل ہیں وہ سائنسی شعور کے ساتھ عصری دنیا کی ترقی کی ایک جھلک دکھاتے ہیں۔ تبصرہ و تعارف سے تنقیدی سرمایے میں اضافہ ہو رہا ہے۔

■ محمد مظہر عالم، ای آر-121، پکا باغ، جالندھر (پنجاب)

"اردو دنیا" ہماری انجمن "بزم ارباب ادب" کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ جولائی کے شمارے میں رحمت اللہ صاحب کا مضمون "اردو زبان کے عصری تقاضے — مسائل اور حل"، "پریم چند کا افسانہ"، "خلائی سفر کے پچاس سال" وغیرہ بہت پسند آئے۔

■ نذیر احمد یوسفی، رحمانیہ اسکول اسٹریٹ، آسنسول-2

"اردو دنیا" کی انفرادیت، اردو رسالوں میں ایک الگ شناخت قائم کرتی ہے۔ ہر نیا شمارہ پچھلے شمارے پر سبقت لے جاتا ہے۔ مشمولات پر آپ کی توجہ بھرپور ہے۔ رنگارنگ عنوانات و موضوعات پر بیش قیمت مضامین کا حصول بھی کچھ آسان کام نہیں۔ اللہ آپ کے حوصلوں کو اسی طرح بلند رکھے (آمین) تاکہ اس کی سج دھج قائم رکھ سکیں۔

■ فاروق احمد درویش پوری، 82، پاگلا روڈ، کرپائی شریف، کولکاتا

میرے مضمون "دسویں کے بعد کیا کریں؟" کو ہندوستان کے صف اول کے رسالے "اردو دنیا" کے اپریل 2008 کے شمارے میں شائع کرنے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ شمارہ مذکور سے متعلق عرض یہ ہے کہ مضمون میرے قلمی نام کے بجائے اصلی نام سے شائع ہو گیا ہے، گذشتہ پندرہ رسالوں میں میری شناخت "فاروق احمد درویش پوری" کے نام سے ہی قائم ہے اور اردو رسالوں کے قارئین اسی نام سے مجھے جانتے پہچانتے ہیں۔

□□□

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کا شمار اردو کے اہم جدید نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب "نئی شعری روایت" نے اردو میں جدیدیت کی بنیادیں مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ کتاب تین مستقل ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب بعنوان بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات لکھا گیا ہے، دوسرا باب نئی جمالیات اور تخلیقی عمل ہے اور تیسرا اظہار و ابلاغ کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔

صفحات: 240، قیمت-/127 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

ہماری بات

ان دنوں ہمارا ملک جن سماجی اور سیاسی حالات سے گزر رہا ہے، ان سے وہ تمام لوگ آزردہ خاطر ہیں جو آنے والے کل کی تصویر آج کے آئینے میں دیکھ لینے والی نظر رکھتے ہیں۔

سماج کی تنظیم کا بنیادی مقصد انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور زندگی کو خوشگوار بنانا ہے۔ کسی نہ کسی سطح پر ہر انسان کسی دوسرے انسان کے تعاون کا محتاج ہے اور اس کی اسی احتیاج نے کچھ سماجی ضابطے پیدا کیے ہیں اور انھیں اعتبار بخشا ہے۔ یہی سماجی ضابطے لوگوں کے حقوق اور ان کے فرائض کا تعین کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص صرف اپنے حقوق کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے اور اپنے فرائض کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھتا تو وہ لازماً معاشرے میں فساد پیدا کرے گا۔ اس وقت ہم اپنے چاروں طرف جو آپا دھاپی دیکھ رہے ہیں، ہر قیمت پر دوسروں سے آگے نکل جانے یا ان کے برابر آجانے کی جو ہوڑ لگی ہے، وہ اسی صورت حال کی غمازی کرتی ہے۔

ہمارے بزرگوں نے ہمیں سکھایا تھا کہ جب تک تمھیں یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ تمھارے پڑوس میں کوئی بھوکا نہیں ہے، تم لقمہ نہ توڑو۔ لیکن ہمارا طرز عمل اب یہ ہے کہ پڑوسی کی بے بضاعتی اور اس کے مقابلے میں اپنے صاحب وسائل ہونے کا احساس ہمیں برتری کے پندار میں مبتلا کردیتا ہے اور ہماری انا کی تسکین کا موجب ہوتا ہے۔ پڑوسی کی مدد تو درکنار ہم اس کی تذلیل کرکے خوش ہوتے ہیں۔ معاشرے میں ہر شخص کسی دوسرے شخص کا پڑوسی ہے، اس طرح یہ صورت حال پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں وہ سماجی عوارض جن کا نام ہے خود بینی، خود غرضی اور خودسری۔ یہ تینوں ذہنی بیماریاں اب اتنی شدت اختیار کرچکی ہیں کہ گھر سے باہر کی دنیا کو تو چھوڑیے، خود گھر کی چار دیواری میں نہ زوجین میں ہم آہنگی اور یگانگت ہے، نہ اولاد کو والدین کا کوئی پاس اور لحاظ اور احترام۔ کچھ برس پہلے کا ایک واقعہ ہم آج تک نہیں بھول سکے ہیں۔ ہمارے ایک دوست تھے، کسی کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے لیکن اردو سے بھی لگاؤ تھا اور یہی ہماری اور ان کی شناسائی اور دوستی کی بنیاد تھی۔ ایک شام انھوں نے ہمیں گھر پر بڑی پرتکلف دعوت دی جس میں ہمارے علاوہ اردو کے دو ایک فنکار اور بھی تھے۔ جاڑوں کا موسم تھا، رات گئے جب ہم لوگ واپسی کے لیے ان کے فلیٹ کا زینہ اترنے لگے تو وہاں ہمیں ایک بوڑھا آدمی نظر آیا جو ایک سیڑھی پر بوسیدہ کمبل لپیٹے بیٹھا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب خانہ کے والد بزرگوار تھے جنھوں نے انھیں پڑھا لکھا کر کسی قابل بنایا تھا اور جن کے لیے اب ان کے شاندار فلیٹ میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ انھیں اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن اسی تنگ و تار زینے پر گزارنے تھے۔

اپنے فرائض کے تئیں بے حسی اور اپنے حقوق کی بے جا طلب کا یہ دائرہ اب بہت پھیل گیا ہے اور اس نے پورے سماج کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ جس طرح بھی ہو مادّی آرام و آسائش اور نمائشی مال و اسباب کا حصول ہی اب زندگی کا اول و آخر مقصد بنتا جارہا ہے۔ پہلے سماج کے دھتکارے ہوئے لوگ ہی چوری، ڈکیتی، زنا بالجبر، قتل وغیرہ کے الزامات میں ماخوذ ہوا کرتے تھے، اب معاشرے میں معزز سمجھے جانے والے لوگ بھی ان جرائم کے ارتکاب سے نہیں ہچکچاتے، ہچکچانا کیسا دھڑلے سے مجرمانہ کارروائیاں انجام دیتے ہیں اور پکڑے جانے پر ان کی جو تصویریں اخبارات میں آتی ہیں، ان میں ان کے چہروں پر شرمندگی نہیں فخر کے تاثرات نظر آتے ہیں۔ مجرموں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ نہ قانون کا خوف ان کے آڑے آتا ہے نہ رسوائی کا خیال۔

ان ساری صورت حال کے پیچھے کئی عوامل کارفرما ہیں لیکن ایک بڑا عامل جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اہل سیاست کا ربط ضبط بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیاست اقتدار میں سب کچھ جائز ہے لیکن اس جواز کا اطلاق جوڑ توڑ کی حد تک ہی قابل قبول ہوسکتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی اور ہمت افزائی اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ خود سیاست کا لبادہ اوڑھ کر ملک کی زمام اقتدار سنبھالنے والوں میں شامل ہوجائیں اپنا کوئی اخلاقی جواز نہیں رکھتا۔ غور کیا جائے تو ساری خرابیوں کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے اخلاقی اصولوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے بے دخل کردیا ہے۔ اخلاقی اصول ہمیں اپنے علاوہ دوسروں کی جائز توقعات اور ان کے جائز مفادات کا لحاظ رکھنا سکھاتے ہیں اور سماج کے تئیں ذمے داری کا وہ احساس پیدا کرتے ہیں جو اجتماعی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے۔

●

قارئین سے گزارش ہے کہ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' کے تحت پوچھے جانے والے سوالات ''اردو دنیا'' کی معرفت بھیجنے کی بجائے براہ راست جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو ارسال کیے جائیں۔ فاروقی صاحب کا پتہ درج ذیل ہے:

29-C, Hastings Road, Civil Lines, Allahabad, U.P.

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

سوال: ہر خاص و عام کی زبان پر ''اَفطار'' (بفتح اول) اور ''سِحری'' (بکسرۂ اول) ہے۔ لیکن لغات میں ''اِفطار'' (بکسرۂ اول) اور ''سَحری'' (بفتح اول) درج ہے۔ کس کو صحیح قرار دیا جائے؟

جواب: ابھی تو زیادہ تر لوگ ''اِفطار'' بکسرۂ اول اور ''سَحری'' بفتح اول ہی بولتے ہیں، لہٰذا اسی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ ہاں ''افطار'' کا اردو ''اَفطاری'' بفتح اول ہی بولا جاتا ہے اور وہی صحیح ہے۔ بعض لوگوں کی زبان پر ''آفطاری'' بھی سنا گیا ہے لیکن یہ عام نہیں ہے لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

(سوال از فاروق احمد درویش پوری، کولکاتا-700058)

سوال: یہ شعر کس کا ہے؟

تکبر عزازیل را خوار کرد
بہ زندانِ لعنت گرفتار کرد

جواب: یہ شعر شیخ سعدی کا ہے۔

سوال: یہ شعر کس کا ہے؟

دل کے ٹکڑے پیشِ خدمت بکف
گر قبول افتد زہے عز و شرف

جواب: دوسرا مصرع بہت مشہور ہے لیکن معلوم نہیں کس کا ہے۔ پہلا مصرع کسی اناڑی شاعر کا معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے جس طرح لکھا ہے اس طرح موزوں بھی نہیں ہے۔ ''دل کے ٹکڑے پیش خدمت ہیں بکف'' موزوں ہوتا، لیکن مصرع بہر حال بہت معمولی ہے۔

سوال: یہ شعر کس شاعر کا ہے؟

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

جواب: یہ شعر نوح ناروی کا ہے۔

سوال: حسب ذیل رباعی کس کی ہے؟

رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں
منہ ڈھانپے کفن میں شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل
تابوت میں کاندھے پہ سوار آیا ہوں

جواب: یہ رباعی میرزا دبیر کی ہے۔ دوسرا شعر آپ نے صحیح نہیں لکھا۔ صحیح شعر یوں ہے:

چلنے نہ دیا بار گنہ نے مجھ کو
اس واسطے کاندھے پہ سوار آیا ہوں

سوال: مصرع: خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ پورا شعر مطلوب ہے۔

جواب: یہ شعر اکبر الٰہ آبادی کے ایک قطعے کا ہے جو انھوں نے سرسید کی وفات پر لکھا تھا۔ پورا قطعہ حسب ذیل ہے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

سوال: مصرع: نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ پورا شعر مطلوب ہے۔

جواب: نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

معاف کیجیے گا آپ نے تمام سوال میرے موضوع سے باہر پوچھے۔ میں نے حسب توفیق جواب تو لکھ دیے ہیں لیکن آئندہ مجھے میرے موضوع سے باہر کسی سوال کے جواب کے لیے مکلف نہ سمجھا جائے۔

(سوالات از کے۔اے۔زرتار، باگل کوٹ)

سوال: مئی 2008 کے ''اردو دنیا'' میں ''خواب'' کے تلفظ کے بارے میں آپ نے جو لکھا ہے اس کا مطلب میں یہ سمجھا ہوں کہ اس لفظ کا تلفظ Khvaab بھی صحیح ہے اور khaab بھی صحیح ہے۔ کیا ایک لفظ کے دو تلفظ ہو سکتے ہیں؟ اور کیا ''خواب'' کو ''خاب'' لکھا جائے تو درست ہوگا؟

جواب: ایک لفظ کے کئی تلفظ ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''زمرد'' بہ سہ حرکت درست ہے، یعنی ''زُمُرُّد / زُمُرَّد / زَمُرَّد'' وغیرہ سب صحیح ہیں۔ ''اُمید'' کا ایک تلفظ ''اُمّید'' بھی ہے، اور ایک تلفظ ''اَمید'' بھی ہے۔ اس لفظ کے اور بھی کئی تلفظ ہیں۔ عربی میں ''قُمقُمہ'' اور ''قُمقَمہ'' دونوں صحیح ہیں۔ رہی یہ بات کہ ''خواب'' کو ''خاب'' لکھا جائے، تو املا اور تلفظ دونوں کا ایک ہی معاملہ ہے۔ جو رائج ہو وہی صحیح ہے۔ اردو میں تو خاص طور پر یہ کوئی شرط نہیں کہ جو بولیں وہی لکھیں بھی۔ لہٰذا ''خواب'' کو ''خاب'' نہیں لکھ سکتے۔

(سوال از صوفی جمال ظاہری، ریتوکوٹ، سون بھدرا)

□□□

قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

شعرِ فراقؔ کی تہذیبی قرأت

اقبال کے بعد جس شاعر کا کلام صحیح معنوں میں ہندوستان کی مٹی سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو اور حسن کا گہوارہ بنا وہ اردو کے عہد آفریں شاعر فراقؔ گورکھ پوری ہیں۔ فراقؔ کے یہاں جس انداز کی ارضیت، دردمندی اور گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے اس کے سبب ان کا رشتہ میرؔ سے بھی قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فراقؔ اگرچہ زندگی کی ہر کروٹ اور ہر جہت پر نثار ہو سکتے ہیں لیکن بشری اور کائناتی حسن میں انھیں ایک خاص الوہی کیفیت اور سرشاری محسوس ہوتی ہے۔ عشق کے دیومالائی قصے، جسمانی لذت اور نسوانی محبت انھیں دیوانہ بنادیتی ہے۔ فراقؔ شاعر ہونے کے علاوہ ایک اہم نقاد بھی تھے۔ ہندوستانی تہذیبی اقدار سے ان کی غیر معمولی وابستگی کا سبب اس خطۂ ارض کے جغرافیائی اور قدرتی ذخائر کا حسن بھی رہا ہے اور فکری، فنی و فلسفیانہ زرخیزی بھی جو ہمیشہ سے ہمارا نشانِ امتیاز رہا ہے۔ وہ اپنے شعری مجموعے ''گلبانگ'' کے دیباچے میں ہندوستانیت اور ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس تہذیب کی قدروں کو جاننے سمجھنے اور محسوس کرنے کے لیے یہاں کی لوک کتھائیں، تہوار، رسوم، روزانہ زندگی کی جزئیات، سنگیت، کلا، رقص اور گھریلو صنعتوں میں جو لوچ، نزاکت، نرمی اور سگھڑپن، سہاناپن اور شانتی رس ہے، اس سے آشنائی ضروری ہے۔ اس تہذیب میں بچپن کا تصور، عورت کا تصور اور ان سب چیزوں سے مل کر صدیوں میں ایک مزاج اور کردار کی تخلیق اور تعمیر ہوئی ہے۔''

فراقؔ کا خیال ہے:

''جس مزاج کو ہندوستانی تہذیب نے جنم دیا ہے، جن وجدانی اور جمالیاتی تجربوں اور قدروں کو ہندوستانی کلچر نے قومی کردار کا جز بنادیا ہے، وہ جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ ہندوستانی تہذیب کے یہ عناصر ترکیبی سدابہار اور سداسہاگ ہیں۔ اس تہذیب کی ہمارے مسلمان ہم وطنوں نے بھی ہندو بھائیوں کے ساتھ ساتھ ناقابلِ فراموش خدمتیں انجام دی ہیں۔''

فراقؔ کی رباعیوں کے حوالے سے جمیل جالبی کا یہ خیال بے حد وقیع ہے کہ ''فراقؔ نے اپنی رباعیوں میں ایک نیا کلچر سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس نے ہندو کلچر کی ان شعاؤں کو اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے جو عالمگیر قدروں کی حامل ہیں۔ اس نے قدیم اساطیر کو رباعیوں میں سمو کر شاعری میں اسلامی کلچر کے ساتھ ساتھ ہندو کلچر کو بھی رچایا ہے۔ جہاں اس نے ہندو کلچر کے اوشا، کرشن، رادھا، دیپ مالا، گھنشیام، اساوری، اپسرا، جے مال، آرتی، شیو، گوکل، اگنر تھ اور دوسرے ریت رواج کو اپنی رباعیوں میں جگہ دی ہے وہاں وہ جذباتی رو میں بھی دوسرے عظیم کلچروں کو نہیں بھولا ہے۔''

فراقؔ کی شعری کائنات میں ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کہکشاں کی صورت میں اس کنارے سے اس کنارے تک نور افشانی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

نئی ہوئی پھر رسم پرانی دیوالی کے دیپ جلے
شام سلونی، رات سہانی، دیوالی کے دیپ جلے
دھرتی کا رس ڈول رہا ہے دور دور تک کھیتوں میں
لہرائے وہ آنچل دھانی، دیوالی کے دیپ جلے
نردھن گھر والیاں کریں گی آج لکشمی کی پوجا
یہ آنسو بیوہ کی کہانی، دیوالی کے دیپ جلے

یا یہ رباعی:

چوکے کی سہانی آنچ، مکھڑا روشن
ہے گھر کی لکشمی پکاتی بھوجن
دیتے ہیں کرچھلی کے چلنے کا پتہ
سیتا کی رسوئی کے کھنکتے برتن

ہندوستانیت اور ہندوستانی ثقافتی و تمدنی سرمایے کی لازوال روایت سے جس قدر فائدہ فراقؔ نے اٹھایا ہے، سچ یہ ہے کہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں اس فراوانی کے ساتھ اخذ و استفادے کی مثالیں نہیں ملتیں۔ فراقؔ اپنے مجموعے ''شبستاں'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ اردو ادب اور شاعری میں ہندوستانیت اس طرح کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے جیسے بھبھوتی، کالیداس، بھرتری ہری اور ٹیگور کی شاعری اور پریم چند کے ادب میں ہندوستانیت ہے۔''

فراق نے اپنی طویل نظم "ہنڈولہ" میں ہندوستان کی ہمہ جہت تکثیری ثقافت اور تہذیبی میراث کے محافظوں میں جن عظیم ہستیوں سے اپنی خاص عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے ان میں کالیداس، تان سین، تلسی داس، بھگت کبیر، رضیہ سلطانہ، امیر خسرو، غالب، حالی، اقبال، وارث شاہ اور ٹیگور کے نام خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔ اس نظم میں ہندوستان کا تصور ایک ہنڈولے کی شکل میں کیا گیا ہے جس میں پورے ہندوستان کی تہذیب خوشی سے پینگ کے لطف اٹھا رہی ہے۔ ایسی ہندوستانی ثقافت جس کی تعمیر و ترقی اور نشو و نما میں تمام قوموں کا مشترک حصہ ہے، فراق خود کہتے ہیں:

سرزمینِ ہند پر اقوامِ عالم کے فراق
قافلے آتے گئے ہندوستاں بنتا گیا

نظم "دھرتی سنگیت" میں ہندوستان کی زمین کو خلا کی رقاصہ کہنے سے بھی اس سرزمین کی عظمت و انفرادیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ نظم "داستان آدم" بھی وطنیت اور قومیت کے بلیغ تصور سے عبارت ایک پر جوش رزمیہ ہے۔ فراق کی غزلوں کے چند اشعار سے اس خیال کی مزید تصدیق ہو سکتی ہے:

زلفِ شب گوں کی چمک، پیکرِ سیمیں کی دمک
دیپ مالا ہے سرِ گنگ و جمن کیا کہنا

روپ کی چاندنی سوزِ دل سوزِ دل
موجِ گنگ و جمن سازِ جاں سازِ جاں

یہ ترا شعلۂ آواز ہے کہ دیپک راگ
قریب و دور چراغ آج ہوگئے روشن

قدِ جمیل ہے یا کام دیو کی ہے کماں
نظر کے پھول گندھے تیر کرتے جاتے ہیں وار

یہ چہرہ صبحِ بنارس یہ زلف شامِ اودھ
کمندِ پیکرِ نازک فضائے خلد شکار

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے سحر کے چراغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس

"روپ" کی ایک رباعی دیکھیں:

نکھری نکھری نئی جوانی دمِ صبح
آنکھوں میں سکون کی کہانی دمِ صبح
آئی ہیں سہاگنیں اٹھائے ہوئے ہاتھ
تلسی پہ چڑھا رہی ہیں پانی دمِ صبح

فراق کی شاعری کا پورا پس منظر ہندوستان کی مٹی، آب و ہوا، روشنی اور خوشبو سے اس طرح آباد ہے کہ یہ خود ایک کائناتِ اصغر بن گیا ہے جہاں سورج چاند اور ستارے بھی ہاتھ باندھے اشارے کے منتظر پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ شعری منظر نامہ ہے جو اردو شاعری سے کہیں زیادہ ہندی شعرا میرا بائی، ودیا پتی اور جے دیو کے ہاں زیادہ تب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔

فراق کی تہذیبی ترجیحات کے تذکرے میں ہمارا ذہن اردو زبان اور اس کی صدیوں پرانی تہذیبی و تاریخی روایت پر بھی جاتا ہے جس نے فراق جیسے وسیع النظر اور روشن خیال شاعر کے لیے ایک کشادہ اور نت نئے تصورات و تجربات سے آباد، زرخیز سرزمین فراہم کی۔ فراق کی شاعری گویا اس زبان کے تعلق سے تاریخی تسلسل کی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔

فراق کو اس بات کا ہمیشہ احساس رہا کہ ہندو مسلم تہذیبی اختلاط کے نتیجے میں ہندوستانی فن تعمیر، ہندوستانی مصوری، ہندوستانی موسیقی اور دوسرے تہذیبی مظاہر میں ایرانی اثرات کے امتزاج سے نئے فنی نمونوں کی تخلیق ہوئی اور تصوف اور بھگتی کے سنجوگ سے ایک نئے فکری نظام کی تشکیل و تعمیر۔ اشتراک و اختلاط کے ان جملہ مراحل میں اردو زبان نے کسی نہ کسی طرح ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور ان تاریخی و تہذیبی سچائیوں کو تخلیقی و لسانی سطح پر Record کرنے اور ان کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا فریضہ اسی زبان نے ادا کیا ہے اور یہ اس زبان کی ہندوستان کو بہت بڑی دین ہے۔

فراق کی کوششوں سے اردو زبان میں صدیوں سے پرورش پانے والے عظیم اور لازوال فنی و فکری سرمایۂ علم و دانش کی نہ صرف بنیادیں مستحکم ہوئی ہیں بلکہ اس باکمال فن کار کی جمالیاتی حسیت اور حکمت و دانائی سے معمور تخلیقات کی بدولت مذکورہ اقدار کے تئیں جذبۂ احترام میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ فراق جس ہندوستانی ثقافت کے انتھک مفسر تھے اس کو محض کسی ایک رنگ، نسل اور ثقافتی تعبیر تک محدود کر کے دیکھنا غلط ہوگا، اس کی بوقلمونی اور ہمہ رنگی ہی اس کی عظمت کی ضامن ہے۔

□□□

پتہ:
Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi-25

مخمور سعیدی

ساغر خیامی — قہقہوں کا سوداگر

آمد: 7 جون 1938 رخصت: 19 جون 2008

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں، جنھیں دیکھ کر آدمی زندگی کی تمام ناگواریاں بھول جائے اور زندہ رہنے کی امنگ اس کے رگ و پے میں خون بن کر دوڑنے لگے۔ ساغر خیامی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام تھا۔ ان کی شاعری ہی nmn نہیں گفتگو بھی کار مسیحائی کیا کرتی تھی، اس کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جسے کبھی ساغر صاحب سے ملنے کا موقع ملا ہو۔ دوسروں کو زندگی کی سوغات بانٹنے والا اور ان کی جھولیوں کو کلکاریوں کے رنگارنگ پھولوں سے بھر دینے والا ایک دن اس طرح خاموشی سے موت کو گلے لگا کر قبر کی آغوش میں جا سوئے گا، یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن سچ یہی ہے کہ ساغر خیامی اب ہمارے درمیان موجود نہیں اور لکھنؤ کے امام باڑہ غفران مآب میں ابدی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ مزے لے رہے ہیں، میں نے ایسے ہی نہیں کہہ دیا ساغر صاحب ناگوار سے ناگوار صورتِ حال کو جس طرح گوارا بنا لیا کرتے تھے اور تلخیوں کو حلاوتوں میں بدل دینے کا سلیقہ رکھتے تھے، انھوں نے موت کو بھی ہنستے ہنستے گلے لگایا ہوگا اور فرشتۂ اجل کو مخاطب کر کے کوئی ایسی بات زبان پر لائے ہوں گے کہ وہ بھی ہنس پڑا ہوگا۔ اپنا ایک لطیفہ خود انھوں نے مجھے سنایا تھا کہ وہ کسی جنازے کے ساتھ قبرستان گئے اور وہاں کوئی ایسی بات کہی جس پر لوگ ہنس پڑے۔ کسی بزرگ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا تو ساغر صاحب نے ان سے کہا ”دیکھیے حضرت جہاں یہ خاکسار ہوگا، لوگوں کو ہنسنے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ میں تو خود اپنی موت پر بھی لوگوں کو ہنساؤں گا۔ کچھ اور نہ بن پڑا تو اپنی ایک ٹانگ ٹیڑھی کر لوں گا کہ جب میت اٹھائی جائے تو ہلتی ہوئی ٹانگ دیکھ کر لوگوں کو ہنسی آ جائے۔“

ساغر صاحب سے میری پہلی ملاقات دلی کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی یہ 1980 کی بات ہے اور وہ غالباً پہلا بڑا مشاعرہ تھا جو انھوں نے دلی میں پڑھا۔ نقیب مشاعرہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ تھے۔ وہ اس وقت تک ساغر صاحب سے زیادہ واقف نہیں تھے انھوں نے ان کا تعارف ان کے مرحوم بھائی، جن کا کچھ مہینے پہلے ہی انتقال ہوا تھا، ناظرؔ خیامی کے حوالے سے کرایا۔ ساغر صاحب مائک پر آئے، ایک مزاحیہ نظم سنائی مگر سامعین کے ساتھ بے تکلفی برتنے کے اس انداز میں نہیں جو بعد میں ان کی پہچان بنا۔ نظم سنا کر وہ مائک سے ہٹے تو میرے پاس آ بیٹھے۔ کہنے لگے آپ مجھے جانتے ہوں کہ نہ جانتے ہوں میں آپ سے واقف ہوں اور آپ کے ساتھ سگریٹ یا بیڑی کے چند کش لگانا چاہتا ہوں میری جیب میں یہ دونوں قاتل زہر موجود ہیں۔ اس طرح اس پہلی ملاقات ہی میں ہماری دوستی کی بنیاد پڑ گئی جو گزرتے وقت کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ ساغر صاحب کو دیگر منشیات سے شغف نہیں تھا لیکن تمباکو نوشی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔

ساغر صاحب ان دنوں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کیمپس میں رہتے تھے جہاں وہ لیب اسسٹنٹ تھے اور میرا قیام ترکمان گیٹ کے علاقے میں تھا۔ یعنی دلوں کی قربت کے باوجود مکانی فاصلہ بہت تھا اور ان کا اپنے گھر سے چل کر میرے ہاں آنا یا میرا اپنے گھر سے چل کر ان کے ہاں جانا آسان نہ تھا اس لیے برسوں تک ہماری ملاقاتیں مقامی اور بیرونی مشاعروں ہی میں ہوتی رہیں۔ ساغر صاحب کی مقبولیت مشاعروں میں روز افزوں تھی اور میں اپنی کم فرصتی کی وجہ سے اس دوڑ میں شریک نہیں تھا اس لیے یہ ملاقاتیں بھی کبھی کبھار ہی ہوتیں۔ لیکن پھر ایک وقت آیا جب ہم پڑوسی بھی ہو گیے۔ ہم دونوں غالب ہاؤسنگ سوسائٹی کے ممبر تھے۔ سوسائٹی کے فلیٹ بن کر تیار ہوئے تو ایک ایک فلیٹ ہمیں بھی ملا اور قرعہ اندازی میں اتفاق سے ہم دونوں کے فلیٹ قریب قریب ہی نکلے۔ اب تو روز ہی ملاقاتیں ہونے لگیں، کچھ عرصے بعد ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر علی جاوید، ہمایوں عباسی اور اسلم خاں بھی غالب اپارٹمنٹ میں آ بسے، اسلم خاں کالج میں ڈاکٹر علی جاوید کے ساتھیوں میں تھے۔ پھر تو لگ بھگ ہر شام کسی نہ کسی کے ہاں محفل آراستہ ہونے لگی اور یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ان محفلوں کی جان ساغر خیامی ہوا کرتے تھے۔

غالب اپارٹمنٹ کی زمین سرکار نے غالب ہاؤسنگ سوسائٹی کو اس یقین دہانی پر دی تھی کہ یہاں جو فلیٹ بنیں گے وہ صرف اردو کے قلمکاروں کے لیے ہوں گے۔ لیکن سوسائٹی کے عہدیداروں نے جو اردو والے ہی تھے، نہ صرف یہ کہ اس یقین دہانی پر عمل نہیں کیا بلکہ جو فلیٹ تعمیر کرائے ان میں میٹریل بھی اچھا استعمال نہیں کیا گیا، ہاتھ لگاؤ تو دیواروں کا پلستر جھڑنے لگتا تھا، دروازے ایسے کہ دراز قد آدمی سر جھکائے بغیر ان میں قدم نہ رکھ سکے۔ سڑکیں ندارد، پانی ناپید۔ ظاہر ہے یہ سب سوسائٹی کے ذمہ داروں اور اس ٹھیکیدار کی ملی بھگت سے ہوا، جسے اپارٹمنٹ کی تعمیری ذمہ داری دی گئی تھی۔ اس صورت حال کے خلاف

کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، انھوں نے ایک احتجاجی جلسہ کیا۔ جلسے میں ساغر صاحب نے اور میں نے نظمیں پڑھیں، جن میں اپارٹمنٹ کے فلیٹوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا تھا، کچھ لوگوں نے تقریریں کیں۔ ساغر صاحب وہ نظم مشاعروں میں بھی سناتے رہے، شروع شروع میں نظم سنانے سے پہلے غالب اپارٹمنٹ کا تذکرہ بھی کیا کرتے تھے بعد میں جب اپارٹمنٹ چھوڑ کر وہ بٹلہ ہاؤس چلے گئے تو یہ تذکرہ ترک کر دیا۔ نظم میں انھوں نے ایسی عمومیت پیدا کر دی تھی کہ اس مخصوص حوالے کے بغیر بھی مزہ دیتی تھی۔

ساغر صاحب کے ساتھ مجھے بیرونِ ملک بھی کئی مشاعروں میں شرکت کا موقع ملا۔ امریکہ، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے مشاعروں میں جنھیں بین الاقوامی مشاعروں کا نام دیا جاتا ہے پاکستانی شعرا بھی مدعو ہوتے ہیں۔ ان کا رویہ ہندوستانی شاعروں کے ساتھ دوستانہ ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے تئیں ان کے دلوں میں کچھ بدگمانیاں بھی ہیں جن کا اظہار کبھی کبھی ان کی گفتگو میں ہو جاتا ہے۔ ایسے ہر موقع پر میں نے دیکھا کہ ساغر صاحب نے ان بدگمانیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ انھیں ایک سچے محبِ وطن کی طرح ہندوستان کی مٹی اور یہاں کی ان روایات سے جنھیں ہم گنگا جمنی روایات کا نام دیتے ہیں، عشق تھا۔ مشہور مزاحیہ شاعر دلاور فگار جن کی پیدائش اور پرورش و پرداخت ہندوستان ہی میں ہوئی تھی اور یہیں ان کی شاعری پروان چڑھی، ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ دبئی کے ایک مشاعرے میں انھوں نے نظم پڑھی جس میں اشارتاً ہندوستان پر ہلکا سا طنز کیا گیا تھا۔ اسٹیج پر ہندوستانی شعرا کے علاوہ سامعین میں بھی ہندوستانیوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی، سبھی نے ناگواری محسوس کی اور اس ناگواری کا اظہار بھی کیا۔ دلاور فگار وہاں تو خاموش رہے لیکن مشاعرے کے بعد کھانے پر ساغر صاحب سے اور مجھ سے کہنے لگے: آپ بتایئے کہ ہندوستان نے نفرت کے سوا پاکستانیوں کو آج تک کیا دیا ہے؟ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، ساغر صاحب اپنے مخصوص انداز میں بولے: "پاکستان دیا ہے" اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

سعودی عرب کے کاروباری شہر جدّہ میں جو مشاعرے ہوتے ہیں، ان کے منتظمین مشاعرے کے بعد شعرا کو زیارت حرمین شریفین کے لیے بھی لے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مشاعرے میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان سے بھی کئی مشہور و معروف شعرا مدعو تھے اور سب شعرا کو ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ مشاعرے کے اگلے دن منتظمین آئے اور شعرا کو زیارت حرمین شریفین کے لیے لے کے چلے۔ شعرا میں احمد فراز، قتیل شفائی اور مجروح سلطانپوری بھی تھے جن کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ملحد ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ دوسرے شاعروں کی طرح یہ بھی لبیک اللھم لبیک کا ورد کر رہے ہیں۔ میں نے مجروح صاحب سے پوچھا یہ کلمات دل سے نکل رہے ہیں یا صرف زبان سے ادا ہو رہے ہیں؟ جواباً مجروح صاحب مسکرا دیے۔ لیکن مسجد الحرام، مسجد ذو قبلتین اور مسجد نبوی ہر جگہ انھوں نے نمازیں بھی پڑھیں۔ فرازؔ اور قتیلؔ نمازوں میں شریک نہیں ہوئے لیکن فرازؔ نے طوافِ حرم ضرور کیا البتہ یہ کہتے ہوئے کہ ذرا صحت بنا رہا ہوں۔ قتیلؔ صاحب کو یہ خیال ستاتا رہا کہ جتنا سونا حرمین شریفین کے در و دیوار کی آرائش و زیبائش پر خرچ کیا گیا ہے، اس سے دنیا کے مفلوک الحال لوگوں کی مدد کی جا سکتی تھی۔ خیر ہمارے ساتھ مشاعروں کے ایک مقبول ہندوستانی شاعر بھی تھے جو ادب میں بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں لیکن ان کی رسائی اس وقت تک پاکستان میں نہیں ہوئی تھی۔ واپس ہوٹل پہنچ کر انھوں نے غالباً پاکستانی شاعروں کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس طرح پاکستان کے مشاعروں میں رسائی کی راہ نکالنے کے لیے کہا کہ میں نے غلاف کعبہ پکڑ کر جو دعائیں کی ہیں وہ پاکستان کی فلاح کے لیے تھیں، یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن انھوں نے یہ کہنا بھی ضروری سمجھا کہ ہندوستان کے حق میں انھوں نے بددعا کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حسبِ عادت دروغ مصلحت آمیز سے کام لے رہے تھے مگر سبھی ہندوستانی شاعروں پر اس کا سخت ردِ عمل ہوا، ساغر صاحب اور یہ خاکسار بھی اشتعال میں آ گئے۔ خود پاکستانی شاعروں کا ردِ عمل بھی موافقانہ نہ تھا۔ اگر ساغر صاحب کو سمجھا بجھا کر دوسرے کمرے میں نہ لے جایا جاتا تو بدمزگی بہت بڑھ سکتی تھی۔ یہ ذکر میں نے اس لیے کیا کہ اس سے ساغر صاحب کی اس مٹی سے اٹوٹ محبت بھی ظاہر ہوتی ہے جس کے وہ پروردہ تھے اور دینی حمیت بھی کہ ان کا ایک ہم مذہب حجاز کی مقدس سرزمین پر یاوہ گوئی کا مرتکب ہوا ہے۔ تو ساغر صاحب صرف ہنسنے ہنسانے والے آدمی ہی نہ تھے، اگر غم و غصے کا محل ہو تو انھیں غصہ بھی آتا تھا اور وہ اس کے اظہار سے ہچکچاتے نہ تھے۔ آخر سیّد زادے تھے۔

ساغر صاحب کی ابتدائی زندگی پریشانیوں میں گزری۔ اگرچہ وہ ایک صاحبِ حیثیت علمی گھرانے کے فرد تھے اور ان کے والد محترم مولانا سید اولاد حسین نقوی شاعرؔ، جو عرفِ عام میں مولانا للّن صاحب کہلاتے تھے، ریاست رامپور میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ پھر وہ رامپور چھوڑ کر ریاست دتیہ چلے گئے اور ذاتی کاروبار کرنے لگے۔ تبھی تقسیم ملک عمل میں آئی اور اس کے نتیجے میں بھڑکنے والی فرقہ وارانہ فسادات کی آگ نے ان کا جو کچھ خاندانی اثاثہ تھا، جلا کر خاک کر دیا۔ مولانا اپنے خاندان کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور از سرِ نو اسبابِ زندگی کی فراہمی میں لگ گئے۔ اس افراتفری میں ساغر صاحب کی تعلیم تو مکمل نہ ہو سکی لیکن زندگی کے گوناگوں تجربات نے ان کے ذہن کو جو روشنی عطا کی وہ کسی درسگاہ میں حاصل نہ ہو سکتی تھی۔

ساغر صاحب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز لکھنؤ ہی سے کیا مگر وہاں ان کے قدم کچھ جمے نہیں اور وہ تلاشِ معاش میں دلّی چلے آئے۔ دلّی غریب

الوطنوں کے لیے ہمیشہ کشادہ دل رہی ہے۔ دلی نے ساغر صاحب کو بھی خوش آمدید کہا اور پھر دھیرے دھیرے انھیں وہ تمام سوغاتیں دیں جن کی کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے۔ محبت، شہرت، دولت، دلی آکر اور یہاں رہ کر ساغر صاحب کو یہ سبھی کچھ حاصل ہوا۔ ساغر صاحب نے بھی دلی کو ٹوٹ کر چاہا لیکن آخر میں لکھنؤ کی محبت غالب آگئی اور وہ ملازمت سے سبکدوشی کے چند سال بعد دوبارہ لکھنؤ جا بسے۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن سنا ہے کہ وہاں انھوں نے اپنے لیے بڑا شاندار مکان تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام مشاعرہ محل رکھا تھا کہ اس کی تعمیر مشاعروں کی آمدنی سے ہی ہوئی تھی۔

ساغر صاحب کی شادی ان کی پھوپھی کی بیٹی سے ہوئی تھی، جن سے ان کے تین بیٹے ہوئے۔ جن کے نام ہیں: حسن راشد، حسن شاہد اور حسن ریال۔ تینوں لائق فائق اور والدین کے فرماں بردار۔ لیکن زندگی میں کچھ کر گزرنے کی تڑپ اور مادی ترقی کی دوڑ میں ہم چشموں سے آگے نکل جانے کی لگن تینوں کو دلی سے ممبئی لے گئی۔ ساغر صاحب بیٹوں کی اولوالعزمی پر خوش تھے مگر دلی میں گھر کا اکیلا پن شاید انھیں کھلنے لگا اور وہ بھی دلی کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ چلے گئے جہاں کچھ پرانی جان پہچان والوں اور بچے کھچے اقربا کے بیچ رہ کر تنہائی کا غم غلط کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اپنی ایک نظم ''مراجعت'' کا ایک بند یاد آتا ہے:

چلو اپنے ہی ویرانے کی جانب لوٹ چلتے ہیں
وہاں شاید یہ چاکِ دامنِ احساس سل جائے
ہمارا جاننے والا، ہمیں پہچاننے والا
پرانے راستوں پر کوئی شاید اب بھی مل جائے

ساغر صاحب سے میری آخری ملاقات رامپور رضا لائبریری کے مشاعرے میں ہوئی جو لائبریری کے او۔ایس۔ڈی وقارالحسن صدیقی صاحب نے رامپور کے آخری نواب اور لائبریری کے معمار اعظم نواب رضا علی خاں کی یاد میں کیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح تپاک سے ملے مگر چہرے پر اضمحلال کے آثار بہت نمایاں تھے۔ خیال ہوا، دوسرے مشاعروں کے تھکے تھکائے یہاں پہنچے ہوں گے اس لیے مضمحل ہیں۔

لیکن مشاعرے کے دوران معراج فیض آبادی صاحب نے جو لکھنؤ سے رامپور تک ان کے ہمسفر تھے، بتایا کہ وہ بیمار ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ علاج کے لیے ممبئی چلے گئے ہیں اور اسپتال میں داخل ہیں۔ کینسر جیسا موذی مرض ان پر حملہ آور ہوا تھا جس سے کہ شفایابی کی امید کم ہی تھی پھر بھی دل یہ نہیں مانتا تھا کہ اپنی شاعری سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو ہنسانے والا اور اپنے لطیفوں سے اپنے دوستوں کی محفلوں کو زعفران زار بنا دینے والا، اس طرح سب کی آنکھیں نم کر جائے گا۔ یہ مصرعہ ساغر صاحب کی موت پر کتنا صادق آتا ہے:

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

ساغر صاحب کے کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے ''انڈر کریز''، ''قہقہوں کی بارات'' اور ''پس روشنی''۔ ان مجموعوں کے علاوہ ان کا کلام کیسٹس اور سی۔ ڈیز میں بھی محفوظ ہے اور ہزاروں لوگوں کے حافظے میں بھی۔ ساغر صاحب زود گو تھے اس لیے ان کا بہت سا کلام ابھی غیر مطبوعہ بھی ہوگا۔ وہ اپنی کلیات مرتب کرنے کے خواہش مند تھے مگر افسوس کہ عمر نے مہلت نہ دی۔ وہ مشاعروں میں ہمیشہ تازہ کلام پڑھتے تھے، کوئی پرانی چیز تبھی سناتے تھے جب سامعین کی فرمائش ہو۔

ساغر صاحب کی پرورش جس تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ہوئی تھی وہ انیس اور دبیر کے مرثیوں کا پروردہ تھا۔ خود ساغر صاحب نے بھی مرثیے لکھے ہیں لیکن ان کی پہچان بنی ایک مزاح گو شاعر کی۔ ان کی زیادہ تر نظمیں مسدس کی ہیئت میں ہیں جو مرثیہ گو شعرا کی پسندیدہ صنف سخن ہے۔ مسدس کا ہر بند، جیسا کہ معلوم ہے، چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شروع کے چار مصرعے ایک قافیے میں اور آخری دو مصرعے جن پر بند تمام ہوتا ہے، دوسرے قوافی میں۔ مسدس کی ہیئت میں ساغر صاحب کی مزاحیہ نظموں کے چار ابتدائی مصرعے بالعموم سنجیدہ شاعری کا نمونہ ہیں، آخری دو مصرعوں میں وہ اچانک اس طرح مزاح کی پٹ شامل کر دیتے ہیں کہ پورا بند مزاحیہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی ایک مشہور نظم ہے ''کرکٹ میچ'' اس کا یہ بند دیکھیے۔ میچ شعرا اور شاعرات کے درمیان دکھایا گیا ہے۔ فیلڈنگ شاعرات کر رہی ہیں:

وہ لال گیند پھول ہو جیسے گلاب کا
جس طرح دستِ ناز میں ساغر شراب کا
سایہ ہوا میں ناچتا تھا آفتاب کا
بمپر میں سارا زور تھا حسن و شباب کا
ایسے بھی اپنے عشق کا میداں بناتے تھے
امپائر ہر اپیل پہ انگلی اٹھاتے تھے

آخر کے تین مصرعے نکال دیجیے تو انیس کی منظر نگاری یاد آجائے گی۔ ایک اور نظم جو مشاعروں میں ان سے بہ اصرار پڑھوائی جاتی تھی اور جس میں مذہب کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو بے نقاب کیا گیا ہے اس کا یہ بند دیکھیے:

ایسی کوئی مثال زمانے نے پائی ہو
ہندو کے گھر میں آگ خدا نے لگائی ہو
بستی کسی کی رام نے آکر جلائی ہو
نانک نے راہ صرف سکھوں کو دکھائی ہو
رام و رحیم و نانک و عیسیٰ تو نرم ہیں
چمچوں کو دیکھیے تو پتیلی سے گرم ہیں

ساغر صاحب کی دوسری پسندیدہ صنف چار مصرعوں پر مشتمل قطعات تھے۔ ان کے دو قطعے بھی ملاحظہ کیجیے جو ان کی حسِ مزاح کی بھرپور جھلک دکھاتے ہیں:

غربت میں ساتھ دیتے نہیں جانور تلک
ایسا ہی ایک سانحہ میری نظر میں ہے
مدت سے میرے ساتھ جو رہتا تھا دوستو
چوہا وہ میرے گھر کا پڑوسی کے گھر میں ہے

مفلسی کے شکار سوتے ہیں
ایک کمبل میں چار سوتے ہیں
کھینچ لے جائے پانچواں نہ کہیں
سب کے سب ہوشیار سوتے ہیں

ساغر صاحب نے زندگی کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کی تیرنگیوں کو بھگتا بھی تھا ان کے مزاحیہ کلام میں سنجیدگی کی جو زیریں لہر کارفرما ہے، وہ ان کے انھی مشاہدات اور تجربات کی دین تھی۔ رضا نقوی واہی اور دلاور فگار کے بعد اردو کی ہم عصر مزاحیہ اور طنزیہ شاعری میں اگر کسی تیسرے نام کی تلاش ہوگی تو وہ ساغر خیامی ہی کا نام ہوگا۔ انھوں نے اپنے لیے ٹھیک ہی کہا تھا:

قہقہوں کے لیے فریاد کرے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

□□□

J-3/141C, Krishna Ganj Extension,
Laxmi Nagar, New Delhi-92

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون "تمہید" کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شمیم طارق

مخدوم کی ایک پر کیف نظم — "چارہ گر"

"چارہ گر" مخدوم محی الدین کی ہی نہیں، اردو شاعری کی بہترین عشقیہ نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کا موضوع محبت کی سرشاری و دل سوزی ہے اس لیے نظم کی ابتدا میں چھوٹے بڑے مقفّٰی اور غیر مقفّٰی مصرعوں کو اس ترتیب سے پیش کر دیا گیا ہے کہ والہانہ کیف و سرور کی ایسی فضا تیار ہو جائے جو محبت کا خاصہ ہے اور قاری محسوس کرلے کہ وہ کون سی خوابگیں کیفیت یا آتش سیال ہے جو لفظوں میں گھول کر اس کو پلائی جانے والی ہے:

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن/ پیار کی آگ میں جل گئے

ان ابتدائی چار مصرعوں کو جو محبت کی تاثیر یا خوابگیں کیفیت کے مظہر ہیں، خبر سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان میں صرف یہ اطلاع دی گئی ہے کہ "دو پیار کرنے والے محبت کی آگ میں جل کر راکھ ہوگئے"۔ لیکن اس نظم کا یا نظم کے ان ابتدائی چار مصرعوں کا صرف یہی مطلب ہوتا تو یہ نظم اردو کی نہایت خوبصورت اور مسحور کن نظم نہ تسلیم کی گئی ہوتی۔ انھیں چار مصرعوں میں محبت کے انجام سے بھی باخبر کیا گیا ہے یعنی جو دو بدن یا دو وجود جل کر راکھ ہوئے ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے اور پھر "چنبیلی کے منڈوے تلے" اور "میکدے سے ذرا دور" جیسے تلازموں اور ترکیبوں کے ذریعے جو آگ سے تضاد کی نسبت رکھتے ہیں، یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو دو بدن پیار کی آگ میں جل کر راکھ ہوگئے، مرنا ان کی مجبوری نہیں رغبت اور کیفیت تھی۔ جو کچھ ہوا ان کی رضا و رغبت سے ایک خاص کیفیت میں ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محبت کا انجام فنا ہے، جانتے بوجھتے انھوں نے محبت کی۔ محبت ان کی سرشت تھی، تقدیر تھی، وہ محبت کے علاوہ کچھ پانا اور حاصل کرنا چاہتے ہی نہیں تھے اس لیے جل کر راکھ ہوگئے۔

اس کیفیت کی مزید تشریح اگلے تین مصرعوں میں ہے

پیار حرف وفا
پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا

بہ ظاہر ان تین مصرعوں میں پیار کرنے والوں کی دلکش تصویر کشی کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ "وفا"، "خدا" اور "چتا" جیسے لفظوں سے نظم کے عشقیہ ماحول میں شدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر حقیقت میں ان تین مصرعوں کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کی محبت میں سرشار عاشق و معشوق کے لیے وصل کا لمحہ وہ لمحہ ہے جہاں دوئی کا ہر احساس ختم ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔

مخدوم کا شمار سعادت مند کمیونسٹوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے پارٹی لائن سے کبھی بغاوت نہیں کی اور کمیونسٹ ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ایسے فلسفۂ حیات میں یقین رکھتے تھے جس میں روحانیت و ماورائیت کا کوئی تصور نہیں ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نظم کی پوری کیفیت اور فضا ماورائی اور روحانی ہے۔ صوفیہ کے ملفوظات سے صرف نظر کر کے پوری نظم خصوصاً ان تین مصرعوں کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ مصرعے اصل میں محبت کے تین مدارج یا مراحل ہیں۔

پہلا مرحلہ "حرف وفا" کا تھا جب "عہد الست" میں تمام ارواح نے محبوب حقیقی سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ دنیا میں اس کو اپنا مالک و محبوب مانتی رہیں گی۔ دوسرا مرحلہ "عہد کی تکمیل" کا تھا یعنی جب انھوں نے اپنے عہد کی تکمیل کرنے یا پابند وفا رہ کر اپنی زندگی کو بامعنی بنایا تھا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انسان کو "پابند وفا" ہونے کے بدلے محبوب حقیقی کے سوا کچھ مطلوب ہی نہیں ہوتا۔ وہ محبوب حقیقی سے اگر کچھ مانگتا ہے تو محبوب حقیقی کو ہی مانگتا ہے اور اگر کسی ذات کو باقی سمجھتا ہے تو وہ ذات حق ہے۔ لسان الحق شاہ تراب علی قلندر نے اس بات کو اپنی غزل کے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

عبث ہے آرزو دنیا و دیں کی
تراب اللہ بس، باقی ہوس ہے

یہی انسان کے لیے بقا کا راز اور ہمیشگی و دوام کا مقام ہے کہ وہ مالک و محبوب حقیقی کی محبت میں خود کو فنا کر دے۔ کیونکہ محبت کے دعوے کے بعد اپنی یا اپنے لیے کسی چیز کی فکر کرنا "ہوس" کے مترادف ہے حقیقی عشق جس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تیسرے مصرعے میں یہی حقیقت اور واضح لفظوں میں بیان کی گئی ہے کہ چونکہ "عشق" اور "ہوس" ایک ساتھ باقی نہیں رہ سکتے اس لیے عشق حقیقی کے بعد ہر چیز فنا ہو جاتی ہے خود محبت کا انجام بھی فنا ہے لیکن ایسی فنا جو حیات دوام یا بقا کی ضامن ہے یعنی عشق اور ہوس دونوں فانی ہیں مگر ہوس کی فنا عشق حقیقی کی بقا ہے اور عشق حقیقی میں فنا بقا کی ضمانت۔

عشق کے ان مرحلوں کو سمجھنے کے لیے ایک علامتی پرندے کی مثال دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ صوفیہ کے حلقے میں اس پرندے کا بہت ذکر کیا جاتا ہے۔ اس علامتی پرندے کا نام ہے "ققنس" جو اپنی آتش نفس میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے مگر بارش کا پہلا قطرہ پڑتے ہی دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے اور اسم اعظم کے ورد سے اپنے وجود کو خاک کرنے میں لگ جاتا ہے۔ زندگی و موت کے اس تسلسل میں وہ بار بار موت سے دوچار ہوتا ہے مگر اس ورد کو جاری رکھتا ہے جس کا منطقی نتیجہ موت ہے کہ موت ہی اس کی سرشت ہے اور وہ جانتا ہے کہ بقا صرف اس

کی شان ہے جو حی و قیوم ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی بقا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ باقی رہنے والی ذات کی یاد میں خود کو فنا کرتا رہے۔

مخدوم نے اپنے دوسرے مجموعۂ کلام ''گلِ تر'' کے دیباچے میں ایک بہت بلیغ جملہ لکھا ہے وہ جملہ یہ ہے کہ ''شعر میں ہم ماورائی کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورائی نہیں ہوتا۔'' یہ مجموعہ 1961 میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ وہ دور تھا جب کمیونسٹ پارٹی کا ادبی محاذ کمزور پڑنے لگا تھا۔ فیض، فراق، ممتاز، حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی اور اختر الایمان، علی سردار جعفری کی ادبی ترقی پسندی کی متعین کی ہوئی تعریف کو سن کر زیرِ لب مسکرانے لگے تھے۔ ہمارے رسائل ان کے درمیان بعض ادبی مناقشوں کے بھی گواہ ہیں۔ ''گلِ تر'' کے دیباچے میں مخدوم نے تخلیقی تجربے کی حیثیت اور شاعر و ادیب کے منصب پر جن لفظوں میں روشنی ڈالی ہے وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ دوسرا شعری مجموعہ شائع ہونے تک ان کے اندر کا شاعر ان کے باہر کے کامریڈ پر حاوی ہو چکا تھا۔

''زمان و مکان کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (Timeless) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے، سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ تہذیب، انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے، جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشوونما کا دوسرا نام ہے، اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا، جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنونِ لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیبِ نفس کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔''

شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے یہی تضاد تخلیق کی قوتِ محرکہ بن جاتا ہے۔

شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضاد تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بہ حیثیت ایک فردِ معاشرہ، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے، پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے، روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالمِ خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔''

مندرجہ بالا سطور میں جو ''گلِ تر'' کے دیباچے سے ماخوذ ہے ''روحانی کرب''، ''تہذیبِ نفس'' اور ''دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں'' جیسی ترکیبوں کے ذریعے شعر اور شاعری کی جس فنی اور فکری بصیرت کا اظہار کیا گیا ہے وہ ان کی پارٹی کے ادبی محاذ کی نعرہ بازی سے بہت مختلف ہے۔ اگر کسی ترقی پسند شاعر کے کلام میں اس فکر و کیفیت کی کارفرمائی ہے تو وہ صرف فیض احمد فیض ہیں۔ فیض اور مخدوم میں ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ وہ نظم اور غزل، دونوں اصنافِ سخن میں یکساں دسترس کے علاوہ جداگانہ شان اور پہچان کے حامل ہیں۔

دونوں نے اپنی شاعری میں لفظوں کو معنوی توسیع کے عمل سے گزار کر معنی کی نئی جہات سے ہمکنار کیا ہے دونوں کی شاعری کا غالب عنصر اس کی والہانہ کیفیت اور چمنستانِ محبت کی وہ فضا ہے جو انگاروں پر لوٹتے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے مشقتیں برداشت کرتے ہوئے تخلیق کاروں کو بھی گل و بلبل کے افسانے بیان کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے کیونکہ فکر و فلسفہ کی حد بندی اور جیل کی چہار دیواری تخلیق کار کے جمالیاتی احساس کو ختم کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ تخلیق کار اپنا جہاں آپ آباد کرتا ہے اور اگر اس کی طبیعت جیل کی چہار دیواری میں گل و بلبل کی داستان بیان کرنے کی ہوتی ہے تو جیل میں بھی گل و بلبل کی داستان بیان کرتا ہے۔ فیض جب راولپنڈی سازش کیس میں جیل کاٹ رہے تھے تو انھوں نے رضیہ سجاد ظہیر کو چند نظمیں بھیجنے کے ساتھ لکھا تھا کہ

''آپ کی فرمائش پر بنے (سجاد ظہیر) نے میری نئی اور فضول سی نظم غالبًا آپ کو بھیج دی ہے۔ میں نے تو منع کیا تھا کہ مت بھیجنا۔ کہیں علی سردار جعفری کی نظر پڑ گئی تو مجھ پر تنزل پسندی کا فتویٰ لگا دے گا۔ یوں بھی لوگ کہیں گے کہ ہمیں جیل میں بیٹھ کر محض گل و بلبل کی سوجھ رہی ہے حالانکہ لکھنے کو اور اتنی باتیں رکھی ہیں۔ بہرصورت آپ باتیں بناتے رہیے ہمارا جیل میں اگر عاشقانہ شعر لکھنے کا جی چاہے گا تو ہم ضرور لکھیں گے۔''

فارسی اور اردو کی شعری روایت میں عاشقانہ اور رندانہ شاعری کو عارفانہ شاعری بنانے کی کامیاب روایت بہت پرانی ہے۔ دونوں قسم کی شاعری میں الفاظ و تلازمات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فیض و مخدوم نے اس روایت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اگر صوفیا نے چشم، ابرو، لب، گیسو، رخ سے ''بصیرتِ ازلی''، ''ربوبیت و عبودیت کا حجاب''، ''نورِ قدس سے عقل کا منور ہونا'' یا ''نفسِ رحمانی''، ''تجلیِ جلالی'' اور ''ذاتِ حق'' جیسے معنی مراد لیے ہیں تو فیض نے ''عشق'' سے جذبۂ حریت''، ''رقیب'' سے رجعت پسندانہ نظام اور ''عقل'' سے زوال آمادہ ذہنیت مراد لی ہے، اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے مخدوم نے ''حرفِ وفا''، ''ان کا خدا'' اور ''چتا'' کو عوامی جدوجہد، انقلاب اور انقلاب برپا کرنے کی تیاری میں مرجانے کی آرزو و آمادگی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان کے استعمال کیے ہوئے لفظوں کی یہ تفہیم انھی کے اس جملے کا آئینہ ہے کہ ''جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشوونما کا دوسرا نام ہے۔'' مخدوم یقینًا ایک ترقی یافتہ فکر کے حامل تھے اس لیے ان کی فکر جمالیاتی احساس کی جملہ خوبیوں سے مالا مال ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظم فنی تکمیل کا بھی احساس دلاتی ہے۔ اس میں داخلیت اور خارجیت، وضاحت اور ابہام پرانے الفاظ اور نئے پیرایۂ اظہار کے امتزاج سے پیدا ہونے والی انوکھی شان پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور خوبی یہ ہے کہ آزاد نظم کے پیرایے میں۔ یعنی اس پیرایے میں جو اس وقت تک ترقی پسندوں میں زوال پسندی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

نظم کے تیسرے بند میں موضوع کا کوئی نیا پہلو اجاگر کرنے کے بجائے عشق کے نقطۂ کمال ''وصل'' کی وہ والہانہ کیفیت بیان کی گئی ہے جس میں دوئی

یا یاس و حرماں کا ہر احساس مٹ جاتا ہے۔ اس بیان میں مخدوم کی استعمال کی ہوئی امیجری ان کے ترقی یافتہ جمالیاتی احساس کی رہین منت ہے۔ اس سے نظم کے عشقیہ ماحول میں بلا کی شدت پیدا ہوگئی ہے۔

دو بدن
اوس میں بھیگتے
چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرف ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رک گئی

چوتھا بند اس یاد دہانی پر مشتمل ہے کہ محبت کا لمحہ، محبت کے جذبے کی طرح تعینات اور حد بندیوں سے مستثنیٰ ہے اس کو بھلے برے، میں نور و ظلمت میں نہیں تقسیم کیا جاسکتا۔ یہ ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔

ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں

نظم کے آخری بند میں محبت کی ابدیت اور ہمہ گیری کو اجاگر کرنے کے بعد ''چارہ گر'' کو مخاطب کیا گیا ہے کہ کیا اس کے پاس ''کیمیائے محبت'' کا کوئی نسخہ ہے؟ مگر اسی پل سوال پوچھنے والے کو یاد آتا ہے کہ نسخۂ کیمیائے محبت پانے کا مطلب فنا ہوجانا ہے لہٰذا وہ دوسرے ہی پل یا اسی سانس میں ''چارہ گر'' سے پوچھ بیٹھتا ہے کہ کیا کیمیائے محبت کا کوئی ایسا نسخہ بھی ہے جو مقصد زندگی کو سرور و کیف میں تو ڈھالے، فنا نہ کرے؟ یہ سوال ایک خاص فلسفۂ حیات اور سماجی جدوجہد سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ اسی سوال کے ساتھ نظم کی ماورائی فضا سماجی شعور میں تبدیل ہوجاتی ہے اور ''گل تر'' کے اس بلیغ جملے کی معنویت سامنے آجاتی ہے کہ ''شعر میں ہم ماورئی کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورئی نہیں ہوتا۔'' ''چارہ گر'' اس نظم کا بہت وسیع استعارہ ہے یہ سیاسی رہبر و مسیحا بھی ہوسکتا ہے اور روحانی شیخ و مرشد اور عالم و رہنما بھی۔

ازازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر/ تری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

نظم کے آخر میں پہلے بند کو مکرر پیش کرنے کے بعد کچھ نئے مصرعوں کے ذریعے مخدوم نے ''مقصد زندگی'' یا محبوبۂ زندگی پر جان دینے والوں پر زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد کرتے ہوئے زندہ رہنے والوں کی اہمیت و فوقیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی مسجد و مندر اور میکدے سے عوامی جدوجہد کو مقصد حیات یا محبوبہ بنا لینے والوں کی تباہی کا نظارہ کرتے ہوئے ان پر سنگ ملامت پھینکنے والوں یا خود فریبی اور رہبانیت کی زندگی گزارنے والوں کو للکارا ہے کہ ظلم و ناانصافی کی جدوجہد کرتے ہوئے آزمائشوں میں زندہ رہنے کا جو لطف ہے اس کو وہ کیا جانیں جنھیں کسی مقصد حیات کو محبوبۂ زندگی بنانے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ رومانی شعرا بھی ایسے شعر کہتے رہے ہیں مثلاً اختر شیرانی نے کہا تھا۔

محبت مبتدا میرا محبت منتہا میرا
محبت ہی محبت ہے حقیقت میں خدا میرا

ترقی پسند شاعروں نے بھی اس روایت کو اپنایا مگر غنائیت اور موسیقیت کو مجروح کیے بنا پرانے لفظوں سے نئے مفاہیم پیدا کر کے شعری روش کو نقطۂ کمال تک پہنچایا فیض نے۔ انھوں نے یہ جانتے بوجھتے کہ اس کا انجام موت ہے ایک نظریۂ حیات یا مقصد زندگی کو نہ صرف محبوبہ کا درجہ دیا بلکہ اس سے محبوبہ جیسا سلوک بھی کیا۔ مثال کے طور پر پیش ہے ان کی نظم کا ایک بند، جس کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مقتل میں محبت کے گیت گا رہے ہیں۔ یہ بیک وقت عاشقانہ شاعری بھی ہے اور انقلابی شاعری بھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح صوفیہ کی شاعری بیک وقت عاشقانہ شاعری بھی تھی اور عارفانہ شاعری بھی:

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' مخدوم کے اس خواب کی سب سے خوبصورت تعبیر ہے جس کو انھوں نے ''گل تر'' کے دیباچے میں پیش کیا تھا۔ وہ زندگی اور مقصد زندگی کے شاعر تھے اور زندگی کے مظاہر اور کیفیتیں اتنی متنوع اور پراسرار ہیں کہ جیسے جیسے ان کا ادراک بڑھتا جاتا ہے زندگی کی معنویت اور زندگی کو مزید بہتر بنانے کی تڑپ بھی بڑھتی جاتی ہے اور بالآخر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ کیا بیداری اور کیا خواب مقصد زندگی پر محبوبۂ زندگی کا گمان کر کے انسان پکارنے لگتا ہے کہ:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

□□□

Flat - 27, 4th Floor, Marzban Mansion,
Byculiah Fruit Market, Mumbai-27 (Maharashtra)

سرورالہدیٰ

محمود ایاز اور جدیدیت

سوغات کے اداریوں اور محمود ایاز کی دیگر تحریروں سے ان کے علم و آگہی کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی دیانت داری کا بھی احساس ہوتا ہے۔ علم و آگہی کی روایت تو ان کے معاصرین میں بہتوں کے پاس تھی لیکن ادبی دیانت داری بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ بعض نقادوں نے تو کھیلے اور ڈنڈی مارنے کے عمل کو علم و ذہانت کا علامیہ بنا دیا، محمود ایاز نے تنقیدی مضامین بہت کم لکھے لیکن ان کے یہاں تنقید اور تجزیے میں جو حساسیت اور دردمندی ہے وہ ان کی ادبی دیانت داری کا لازمی نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ سوغات کے اداریوں نے اپنے زمانے کے ادیبوں اور فن کاروں کو جتنا متاثر کیا وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ سوغات میں شائع ہونے والے خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ محمود ایاز کے اداریے اور دیگر مشمولات پر اپنی بے باکانہ رائے دیا کرتے تھے۔ گزشتہ چند روز قبل بلراج مین را مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے کبھی غور کیا کہ میں نے ''شعور'' میں خطوط کا کالم کیوں نہیں رکھا۔ ان کا خیال ہے کہ عموماً رسالوں میں جو خطوط چھپتے ہیں ان کا مقصد مدیر کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے لوگ غیر ضروری تعریف کرتے ہیں۔ مین را کے خیال سے بڑی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن کم سے کم سوغات میں چھپنے والے خطوط سنجیدہ اور معروضی ہوا کرتے تھے۔ خطوط لکھنے والے اس زمانے کے اہم ترین لوگ ہوا کرتے تھے۔
آج عموماً رسالوں میں اردو کے عام قارئین کی رائیں شائع ہوتی ہیں۔ اول درجے کے قلم کاروں اور فن کاروں کے نزدیک خطوط کا شائع ہونا خود کو بھیڑ میں شامل کرنا ہے۔ یہ شکایت بھی ایک حد تک قابل قبول ہے کہ اب سوغات جیسے رسالے کہاں ہیں۔ سوغات میں ''بازگشت'' کے عنوان سے خطوط شائع ہوا کرتے تھے سوغات دور اول کے دوسرے شمارے میں جن لوگوں کے خطوط شائع ہوئے ان کے نام کچھ اس طرح ہیں، قرۃ العین حیدر، اختر الایمان، کرشن چندر، جذبی، محمد حسن، شاد عارفی، اسلوب احمد انصاری، سہیل عظیم آبادی، جیلانی بانو، شفیق فاطمہ شعری، باقر مہدی، وحید اختر اور شاذ تمکنت۔ سوغات میں شائع ہونے والے خطوط کے مطالعے سے بھی اس دور کے ادبی میلانات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ سوغات کے اداریے کتابی اور مکمل شکل میں کہیں ایک جگہ نہیں ملتے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے سوغات کے اداریوں کے اہم اقتباسات کو بڑی محنت اور سلیقے کے ساتھ مرتب کر دیا ہے جو سوغات ہی کے محمود ایاز نمبر (نومبر 1997) میں شامل ہے۔ شمس الحق عثمانی ہمارے شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سوغات کے ابتدائی شمارے اب بے رنگ اور بوسیدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن ان دھندلے اور بے رنگ ہوتے ہوئے الفاظ میں اتنی کشش ہے کہ ہم بار بار انھیں پلٹنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ خوبصورت اور دیدہ زیب کتابوں کی چمک دمک سے قاری کی آنکھیں خیرہ ہیں سوغات کے یہ شمارے ہمیں داخلی طور پر قوت اور روشنی عطا کرتے ہیں۔ لہٰذا سوغات کے چند ابتدائی شمارے (جنھیں دور اول کہنا چاہیے) ہمارے مطالعے کا حصہ ہیں اس مطالعے کا مقصد محمود ایاز کو نقاد یا غیر معمولی مدیر ثابت کرنا نہیں اور نہ محمود ایاز کو ان القاب کی ضرورت ہے۔ یہ پچھلا اور پرانا ورق یوں ہی پلٹ نہیں آیا بلکہ اس میں میرے شعور کا دخل ہے۔ آپ اسے محمود ایاز کے اداریوں سے ادب کے ایک عام قاری کا مکالمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس مکالمے پر کسی کا کوئی جبر نہیں ہے۔ میں نے جب موضوع کا انتخاب کیا ہے ممکن ہے اس حوالے سے لوگوں کے ذہن میں کچھ باتیں ہوں لیکن اب اسکا وقت آ گیا تھا کہ جدیدیت کے سیاق میں بھی محمود ایاز کی ادبی کاوشوں خصوصاً ان کے اداریوں کو دیکھنے کی سنجیدہ کوشش ہوتی۔ اس مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ محمود ایاز کی جدیدیت بعد میں رونما ہونے والی جدیدیت سے کتنی مختلف ہے یا مماثل ہے۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد آج سوغات کے اداریوں پر گفتگو یا مکالمے کا جواز کیا ہے جبکہ ہمارے ادب کے مسائل آج پہلے سے خاصے مختلف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فکر و آگہی کا کارواں کسی ایک مقام پر رکا نہیں گرچہ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ کسی خاص عہد میں فکر و خیال کی دنیا پر جمود سا طاری ہے۔ عموماً ہم ادب کے جس بدلے ہوئے منظرنامے پر اصرار کرتے ہیں اس کا تعلق تنقیدی اور نظریاتی مسائل سے زیادہ ہوتا ہے اور تخلیقی ادب سے کم۔ تخلیقی ادب تنقیدی مسائل کی طرح تبدیل نہیں ہوتا۔ محمود ایاز کی تحریروں کا اثر ہر اس قاری پر ہونا لازم ہے جس نے گزشتہ چند برسوں کے ادبی منظرنامے کو بہت قریب سے دیکھا ہو۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ نظریے کا جبر ہمیں ہر طرف سے کاٹ کر مفلس اور قلاش بنانا چاہتا ہے۔ ہمارے تعصبات اور تحفظات کی بنیادیں علمی کم اور غیر علمی زیادہ ہیں۔ کس قلم کار کو پڑھنا ہے اور کس قلم کار کو نہیں پڑھنا ہے اس کا فیصلہ ہم نہیں بلکہ ہمارے مرشد کرتے ہیں۔ ایک خاص مدت میں ہمیں اپنی ذہنی تربیت ایسی کر لینی چاہیے کہ مختلف میلانات کے

ادیبوں اور فنکاروں کو پڑھ کر اپنے ذوق سلیم کا ثبوت پیش کرسکیں۔ دوسروں کو پڑھنے کے سلسلے میں ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا رہنا محرومی کے سوا کچھ اور نہیں۔ خودساختہ معیاروں کا چاہے کچھ بھی جواز ہو لیکن انھیں علمی اور منطقی بنیادوں پر مبنی ہونا چاہیے۔ دماغ کی کھڑکیاں حسن عسکری، احتشام حسین اور کلیم الدین احمد تینوں کے لیے کھلی رہنی چاہیے تاکہ اختصاص کے نام پر قبل از وقت ہم کسی گروہ کے امام نہ بن جائیں۔ محمود ایاز نے اپنی تحریروں کے ذریعے اسی امامت کے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔ انھوں نے اختلاف اور اتفاق کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اختلاف کسی بھی صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے ایک ایسے وقت میں سوغات کو جاری کیا جب ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش جاری تھی۔ محمود ایاز نے جو لائحۂ عمل طے کیا اس میں کسی طرح کی سیاست اور منافقت نہیں تھی۔ اس عبوری دور کی صورت حال ہے سے انھوں نے ایسا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جس سے ان کے نقاد یا ادب کے امام بننے کی راہ ہموار ہو۔ ان کی وفاداری کسی مخصوص طبقے سے نہیں تھی اور نہ انھیں قیادت کا شوق تھا۔ ان ہی دنوں وحید اختر نے ''صبا'' میں سخن گسترانہ کے عنوان سے عصر حاضر کی صورت حال پر لکھنا شروع کیا تھا جس کا اہم واقعہ سجاد ظہیر کا وہ مضمون ہے جو وحید اختر کے مضمون کے جواب میں شائع ہوا۔ سجاد ظہیر کے مضمون کا عنوان تھا'' ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے۔'' وحید اختر نے جواب دیا'' تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے۔'' وحید اختر نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہا تھا۔ باقر مہدی نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش کو مستقل طور پر اپنا موضوع بنایا۔ آل احمد سرور نے جدیدیت کو اعتدال پسندی کی راہ دکھائی، جس کی باقر مہدی نے سخت گرفت کی تھی۔ محمد حسن نے ''نئی جدیدیت نئی ترقی پسندی'' کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا جو ''کتاب'' لکھنؤ میں شائع ہوا۔ ترقی پسند تحریک کی سخت گیری کے خلاف خلیل الرحمن اعظمی نے جو موقف اختیار کیا اس نے بھی جدیدیت کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان تمام واقعات اور کارگزاریوں کی تاریخی اہمیت ہے لیکن محمود ایاز نے جدیدیت اور ترقی پسندی کے مسائل کو جس طرح سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی تھی وہ ایک دیانت دار ادیب اور صحافی کا تاریخی کردار تھا۔ اس میں ترقی پسندی کے خلاف ایسا کوئی ازلی بغض اور انتقامی جذبہ نہیں تھا۔ اگر جدیدیت کے بعض شارحین نے ترقی پسندی کی مخالفت کو اپنا بنیادی مقصد نہ بنایا ہوتا تو شاید جدیدیت کچھ زیادہ بامعنی رول ادا کرسکتی تھی۔ 1970 کے بعد کی جدیدیت نے محمود ایاز کی جدیدیت سے کچھ سیکھا نہیں۔ ترقی پسندی سے نپٹنے کا آسان طریقہ یہ سمجھا گیا کہ علی سردار جعفری اور محمد حسن کی خبر لی جائے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس عمل میں وہ لوگ بھی شریک ہیں جن کی ذہنی سطح نہایت پست ہے اور جو مجاز مرسل کی تفہیم سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ محمود ایاز نے سوغات کے ذریعے ایسے عناصر کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کی تمام تر دلچسپی ایماندارانہ جذبے کے ساتھ نئی صورت حال کو سمجھنے اور سمجھانے میں تھی۔ ترقی پسندی کو انھوں نے مسئلہ نہیں بنایا جہاں ضرورت پڑی وہاں اختلاف سے بھی کام لیا۔ محمود ایاز نے سوغات کے دور اوّل کے کئی اداریوں میں ان تمام سوالات پر اظہار خیال کیا جو بعد کو جدیدیت کا شناس نامہ بن گئے۔ لیکن بعد کے جدیدیوں نے محمود ایاز کی ایماندارانہ کوششوں کا اعتراف نہیں کیا۔ محمود ایاز کے یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

''آج سوال صرف اقدار کے انحطاط اور ادب میں جمود کے ماتم کا نہیں بلکہ ان مظاہر کے پس پشت انسانی اقدار کے زوال کے جو محرکات کارفرما ہیں ان کی تشخیص اور چارہ گری کا ہے...... آج انسان کو آئینہ میں اس کے مسخ شدہ خدوخال دکھا کر بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسی مسخ شدہ صورت کو انسان اپنی اصلی شکل سمجھنے لگا ہے۔ جب تک اس کے سامنے اس کے کھوئے ہوئے خدوخال کی تصویر نہ ہو وہ موجودہ مسخ شدہ صورت کی وحشت اور دہشت کو محسوس نہیں کرسکتا۔ آج صرف آئینہ بتانے یا شائستگی سے کام نہیں چل سکتا بلکہ حال کی تاریکی کو مستقبل کی روشنی میں بدلنے کے لیے ماضی کی انسانی روایات کی بازیافت کی جوت بھی جگانی ہوگی... یہ بجا کہ ہمارے ہاں ابھی صحیح معنوں میں صنعتی دور کا مکمل ظہور بھی نہیں ہوا لیکن بیرونی ممالک میں صنعتی انقلاب کے ساتھ جو فکری انقلاب پیدا ہوا وہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کو مکمل طور پر متاثر کرچکا ہے اور اس خوش فہمی میں ہم کب تک مبتلا رہ سکتے ہیں کہ ہمارے کروڑوں عوام ابھی اعتقاد اور یقین سے محروم نہیں ہوئے... اس وقت ہمارے ہاں سوچنے اور سمجھنے والے طبقے کے افراد اس ذہنی مزاج سے دوچار ہیں جو اس وقت دنیا بھر میں عام ہو چلا ہے۔ اشتراکیت نے تھوڑی دیر کے لیے اس بے یقینی اور انارکی لہر کو روکنے میں مدد ضرور دی لیکن بہت جلد اس فصیل میں بھی رخنے پڑ گئے...... ادب میں شعور سے لاشعور کی طرف ہجرت، اندرونی خودکلامی کا استعمال اساطیر اور دیومالاؤں کی داستانوں کی تجدید، ذات کے دائروں میں پناہ گزیں ہوکر اپنے حواس اور اعصاب کو فکر کا محور اور معیار بنانا۔ یہ سب باتیں اس حقیقت کا اظہار ہیں کہ فن کار بیرونی دنیا کی جھوٹ، منافقت اور ریاکاری میں حسن، خیر اور صداقت کی قدامت سے مایوس ہوکر ہمت نہیں ہار گیا ہے بلکہ اس نے اپنی تلاش کا رخ اب اپنی روح اور وجود کی گہرائیوں کی طرف موڑ دیا ہے۔''

(سوغات دوسرا شمارہ ص 5,6,8,9)

اس اقتباس کو پڑھ کر وہ لوگ خوش ہوں گے جنھوں نے تنہائی، اداسی اور بے یقینی کی کیفیات کو جدیدیت کا لازمہ قرار دیا تھا۔ محمود ایاز نے مندرجہ بالا اقتباس میں اپنے ملک کی صورت حال کو عالمی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ

اس بات پر متفق تھے کہ صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقیات کے نتیجے میں عالمی برادری پر جو کچھ گزری ہے اس سے ہمارے ملک کا باشعور طبقہ نہ صرف غافل نہیں بلکہ بڑی حد تک متاثر بھی ہے۔ محمود ایاز نے یہاں تک لکھا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے کی پیدائش اور نشوونما مغرب کی فکری فضا میں ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ محمود ایاز نے مغرب کے فکری ماحول کو ہندوستان کی ایک چھوٹی سی آبادی سے مشروط کیا ہے۔ بلراج مین را نے اپنے تاریخی مضمون ''تنبولا'' میں اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ محمود ایاز کی اس تحریر کے نیچے مئی 1959 کی تاریخ درج ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک کے نظریات سے الگ ہو کر سوچنے اور محاسبہ کی طرف جن لوگوں نے مائل کیا ان میں محمود ایاز کا نام کئی اعتبار سے فائق ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ پورا اداریہ پیش کیا جائے۔ انھوں نے چھ صفحات کے اس نقش اوّل (اداریے) میں جدیدیت کے تمام بنیادی مسائل کو سمیٹ لیا ہے لیکن پوری گفتگو میں جدیدیت کی اصطلاح کو استعمال نہیں کیا محمود ایاز کی اس تحریر کا زمانہ ترقی پسند تحریک کی سخت مخالفت اور بیزاری کا زمانہ ہے۔ لیکن وہ کسی بھی مقام پر غیر ضروری طور پر ترقی پسندی کو برا نہیں کہتے۔ بلکہ صرف اتنا لکھتے ہیں کہ ''اشتراکیت نے تھوڑی دیر کے لیے اس بے یقینی اور انارکی کی لہر کو روکنے میں مدد ضرور دی لیکن بہت جلد اس فصیل میں رخنے پڑنے لگے۔'' کوئی اور ہوتا تو اسی ضمن میں ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک تقریر داغ دیتا۔ محمود ایاز نے جس نئی حسیت پر روشنی ڈالی ہے اس کا ایک سماجی اور تاریخی پس منظر ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ وہ نئی حسیت کی بنیادیں ادب کے ادبی معیار میں نہیں بلکہ انسانی زندگی اور اس کے عصری مسائل میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ بات واقعی پریشان کرتی ہے کہ ادب کے ادبی معیار اور خالص ادب پر زور دینے کا سلسلہ کس سماجی اور تہذیبی ضرورت کے نتیجے میں شروع ہوا۔ یہ بات تو ادب کا ہر باشعور طالب علم جانتا ہے کہ ادب کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا فیصلہ ادبی معیار ہی کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اسی لیے باقر مہدی نے لکھا تھا کہ ادب میں یہ خالص ادب کی آہنی دیوار اٹھانے کی ضرورت کیا ہے۔ یہ کہنا بھی بڑی زیادتی ہوگی کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں کا پہلا دستہ ادب کے ادبی معیار سے واقف نہیں تھا۔ ان میں سے بہت لوگ آج ہمارے درمیان نہیں لیکن اس دور کی سیاسی اور سماجی صورت حال اور تقاضوں کو نظر انداز کرکے ہم آج انھیں ادب کے ادبی معیار کا سبق پڑھاتے ہیں پھر بھی کہ اس دور کے پورے ادبی سرمایہ کو ہم اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر رد کر دیتے ہیں۔ محمود ایاز کے نزدیک نئی حسیت کی تعبیر وتشریح کا مطلب ادب کے ادبی معیار کو رائج کرنے سے زیادہ پامال ہوتی ہوئی انسانی قدروں کو دوبارہ بحال کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ ادبی معیار اپنی جگہ اہم تو ہیں ہی۔ لیکن اس کے نام پر سماج، تاریخ اور دیگر معاملات سے آنکھیں بند کر لینا محمود ایاز کو گوارا نہیں تھا۔ اسی اداریے میں محمود ایاز نے لکھا تھا

''ایک فن کار کے لیے صرف ایک راستہ کھلا رہتا ہے زندگی میں کسی ایسے تصور کی تلاش کا جو رابطہ باہم کا کام انجام دے سکے۔ ان اقدار کی دریافت یا بازیافت کا راستہ جس کی بنیاد پر آدمی ایک دوسرے کے انسانی تجربوں میں شریک ہو سکیں۔'' (سوغات دوسرا شمارہ ص9)

محمود ایاز کے بعد ان اقدار کی جستجو اور انسانی تجربوں میں شریک ہونے کی فکرمندی فن پارے کے لفظیاتی نظام کی تشریح وتعبیر کی نذر ہوگئی۔ محمود ایاز، لاشعور، ہجرت، اندرونی خود کلامی، اساطیر، داستانوں کی تجدید، روح کا سفر، وجود کی گیرائی، احتساب نفس جیسی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں۔ مگر وہ انھیں حیات وکائنات سے انسان کے نئے رشتے کی جستجو کا نام دیتے ہیں۔ اس سیاق میں انھوں نے بودلیئر، جوائس اور کافکا کے نام لیے ہیں۔ اردو میں اس نئے رشتے کی جستجو کے تعلق سے اختر الایمان، یوسف ظفر، مجید امجد، مختار صدیقی، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور حسن عسکری کی کوششوں کی انھوں نے تعریف کی ہے محمود ایاز نے ''سوغات'' کے پہلے دور کے دوسرے شمارے میں ادب کی نئی صورت حال پر پہلا مضمون محمد حسن جیسے ترقی پسند نقاد کا شائع کیا۔ اس مضمون کے تعلق سے محمود ایاز نے اداریے میں لکھا تھا۔

''محمد حسن کے مضمون میں بعض باتیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ دو ایک جگہ ان کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف بھی ممکن ہے...لیکن اس سے قطع نظر اس مضمون میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں اور جن باتوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے وہ بے حد فکر انگیز ہیں۔'' یہ الفاظ ایک ذمے دار ادیب اور مدیر کے ہیں۔ اس اقتباس سے بھی محمود ایاز کی ادبی ایانت داری کا اظہار ہوتا ہے۔ محمد حسن تمام عمر ترقی پسند پر اصرار کرتے رہے۔ ان کے بہت سے یاروں نے زمانے کے ساتھ مفاہمت کر لی لیکن محمد حسن اپنی وضع پر قائم ہیں آج نئی نسل میں محمد حسن کا احترام اس وجہ سے بھی ہے کہ انھوں نے اپنے نظریے سے وفاداری کا ثبوت پیش کیا اور بنیادی طور پر ان کا سودا دنیوی اعتبار سے زیاں کا تھا، محمود ایاز نے محمد حسن کی تحریر کو فکر انگیز کہا ہے یہاں موقع نہیں کہ محمد حسن کے مضمون ''نئے ادبی تقاضے'' پر باضابطہ مکالمہ قائم کیا جائے واقعی یہ تحریر محمد حسن کی عصری آگہی اور علمی مطالعے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ سوغات کے دور اول کے تیسرے شمارے کا اداریہ بڑی حد تک محمد حسن کے مضمون کی فکرمندی سے مماثل اور متاثر ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ دوسرے شمارے میں محمد حسن نے جن مباحث کو چھیڑا تھا تیسرے شمارے میں محمود ایاز نے اسے اپنے علمی آگہی کے ساتھ پیش کیا۔ محمد حسن کے مضمون کے ردعمل میں سوغات کے تیسرے شمارے میں باقر مہدی اور

علی جواد زیدی کے مضامین شائع ہوئے۔ محمد حسن نے بہت تفصیل سے ادب اور زندگی کے نئے تقاضوں پر روشنی ڈالی تھی مگر ان کا نظریہ بدلی ہوئی صورت حال کو دوسروں کی روشنی میں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ محمود ایاز نے سوغات کے تیسرے شمارے کے اداریے میں انفرادیت، تنہائی، بے یقینی اور دیگر مسائل کے خطرات سے آگاہ کیا ہے دوسرے شمارے میں انھوں نے ان سچائیوں کا اعتراف کیا تھا جن کا حوالہ جدیدیت کے سیاق میں دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں محمود ایاز ایک فن کار اور ادیب کو زندگی اور سماج کے تئیں اس کی ذمے داریوں کو یاد دلاتے ہیں۔ ''ترقی پسند تحریک نے ایک دور میں افکار و زبان پر جس قسم کی پابندیاں عائد کردی تھیں اس کے خلاف احتجاج اور بغاوت قابل فہم ہیں لیکن جب یہ بغاوت اور احتجاج کسی سمت کے تعین ہی سے بے نیاز ہوجائیں تو خطرناک بن جاتے ہیں...آزادی ہر قسم کی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کا نام نہیں بلکہ ذمے داری کے احساس کا نام ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے ادیبوں کی موجودہ نسل اس احساس ذمے داری سے محروم ہے اور ایک غیر ذمے دارانہ رویہ کو خود فریبی اور دنیا فریبی کے لیے تشکیک، ذہنی آزادی کی لگن اور فنی اقدار سے لگاؤ کا نام دیا جارہا ہے...... پچھلی نسل والے تو خیر تھوڑی بہت دور تک تحریک کے دھاروں پر بہتے ہوئے نکل گئے لیکن موجودہ لوگ زیادہ دیر تک اپنی خود فریبیوں سے کام نہیں چلا سکیں گے۔ کاش کوئی انھیں بتاتا کہ خارج سے عائد کردہ جبر اور آمریت سے چھٹکارا پانا آسان ہے لیکن تن آسانی اور خود فریبی کے پھندوں سے بچنا اپنی ذات اور نفس کی گرفت سے آزاد ہونا مشکل ہے زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک مخلص رویہ اختیار کرنا خون جگر سے اپنے فن کی تزئین کرنا نہ کل آسان تھا نہ آج آسان ہے۔''

(سوغات تیسرا شمارہ ص 5,6,7)

محمود ایاز کی نظر میں ترقی پسند تحریک کی آمریت کے خلاف بغاوت فطری تھی لیکن وہ اس بغاوت کے نام پر فراریت کے قائل نہیں تھے۔ مندرجہ بالا اقتباس کا ہر جملہ اس دور کے ادب اور ادیبوں پر بے باکانہ تبصرہ ہے۔ بلکہ محمود ایاز کے یہ جملے کسی بھی عہد کے ادیبوں اور فن کاروں کو آئینہ دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ محمود ایاز نے تو بغاوت اور احتجاج کی سمت کے تعین کی بات 1960-62 میں کہی تھی لیکن آج کی ادبی صورت حال کیا ہے کیا ہمارے زمانے کے ادیبوں اور فن کاروں کو اپنی منزل کا پتہ ہے کیا انھوں نے حیات اور کائنات کے سلسلے میں کوئی نظریہ قائم کیا ہے کہنے کو تو ہمارا وقت تنقیدی نقطۂ نظر سے آگے نکل آیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محمود ایاز کے ان جملوں کے آئینے میں ہمارے عہد کا چہرہ بھی شرمندہ ہوتا ہے۔ خالص ادب کی مخالفت کرنے والے لوگ بھی بیشتر صورتوں میں خاموشی کے ساتھ اسی رویے کا دم بھرتے ہیں جس کے خلاف محمود ایاز نے آواز اٹھائی تھی۔ محمود ایاز کا داخلی دکھ یہ ہے کہ ذہنی آزادی کے نام پر ہمارے ادیبوں اور تخلیق کاروں نے زندگی اور سماج کے تئیں کوئی فعال اور صحت مند کردار ادا نہیں کیا۔ یہاں زندگی اور سماج جیسے الفاظ کو دیکھ کر وہ لوگ منھ بنائیں گے جو ادب کو محض ہنرمندی اور صناعی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ محمود ایاز کے اس جملے پر کاش سنجیدگی سے غور کیا جاتا۔

''خارج سے عائد کردہ جبر اور آمریت سے چھٹکارا پانا آسان ہے لیکن تن آسانی اور خود فریبی کے دھندوں سے بچنا اپنی ذات اور نفس کی گرفت سے آزاد ہونا مشکل ہے۔''

محمود ایاز نے ابتدا ہی میں محسوس کرلیا تھا کہ تشکیک اور ذہنی آزادی کو فنی اقدار کا نام دیا جائے گا چنانچہ آگے چل کر ان کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ محمود ایاز نے 1960 میں بغاوت اور احتجاج کی سمت کے تعین کی بات کی تھی۔ اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ بعد کو بغاوت اور احتجاج کی جو سمت متعین ہوئی وہ اس زمانے کے تقاضے سے کتنا ہم آہنگ یا مطابق تھا اور محمود ایاز سمت کے تعین سے متعلق خلوص کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ عام سا لفظ ہے مگر اس کے نہ ہونے کی صورت میں بعض جدیدیوں نے فکری انتشار اور مغالطوں کو بڑھاوا دیا۔ محمود ایاز نے اپنے اداریوں میں اس مسئلے پر اپنا موضوع بنایا کہ سماج میں ادب اور ادیب کا رول کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ یہ موضوع اس لیے بھی اہم تھا کہ ترقی پسند تحریک سے ناراض ہوکر لوگ ادب کو ذاتی اور انفرادی تجربے کا مرہون منت قرار دینے لگے تھے۔ اگر ترقی پسند تحریک نے بعض کم سوار تخلیق کاروں کو ان کے کمٹ منٹ کی وجہ سے بڑا یا اہم قرار دیا تھا تو دوسری طرف ترقی پسندی کی مخالفت میں کچھ ایسے لوگ بھی نوازے گئے جن کے فکر واحساس کی دنیا چھوٹی تھی۔ محمود ایاز اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ تحریکات اور نظریات کی پاسداری کسی کو بڑا ادیب نہیں بناسکتی، اسی لیے محمود ایاز نے سوغات کے چوتھے شمارے کے نقش اوّل (اداریے) میں بہت تفصیل اور سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے کہ فن کار منصب کیا ہوتا ہے ادب میں ذاتی تجربے کا مطلب کیا ہے، اور یہ کہ ہر کس و ناکس فن کار نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں انھوں نے غیر ذاتی اور شعوری تعلق پر بہت زور دیا ہے۔ وہ یہاں شکوہ کرتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے ادیبوں کی آزادی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن اس تیسرے اداریے میں ہی محمود ایاز نئی نسل کی ذہنی آزادی کے مطالبے کو آنکھ بند کرکے قبول نہیں کرتے۔ اس موقع پر محمود ایاز اپنے خلوص اور ایمانداری کو اپنا راہنما بناتے ہیں۔ کئی موقعوں پر یہ محسوس ہوتا ہے وہ ترقی پسند فکر ہی کو ایک نئی صورت میں پیش کررہے ہیں اور ساتھ ہی جدیدیت کے ابتدائی اور بنیادی شارح کے طور پر وہ سامنے آتے ہیں۔ میں اسے ترقی پسندی اور

جدیدیت کی کشمکش کا نام دے کر محمود ایاز کے فکرمندی کو دوسروں کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کشمکش نہیں بلکہ محمود ایاز کا اپنے عہد کے تئیں جامع ادبی رویہ ہے۔ اور ترقی پسندی زندگی کی بنیادی قدر میں شامل ہے۔

" ہر فن کار کو لازماً اپنے دور اور نظام حیات کی نفی کرنی پڑتی ہے لیکن یہ نفی اور انحراف اپنے دور سے یا زندگی سے فرار نہیں ہوتا بلکہ اس انحراف کی بنیاد پر اپنے دور سے اس کا رشتہ قائم ہوتا ہے وہ انسانی اقدار جو اس کے معاشرے میں ناپید ہو چلی ہیں ان انسانی اقدار کے تصور سے فن کار کی تخیلی حقیقت کی تشکیل ہوتی ہے اس تخیلی حقیقت کو واقعاتی حقیقت میں بدلنے کے لیے وہ اپنے فن کو ذریعہ بناتا ہے اس طرح فنی تخلیق ایک عظیم ذمے داری ایک پیغمبرانہ اور ایک مقدس تلاش بن جاتی ہے.......... تخیلی حقیقت کا وجود ہی اس اعتراف پر منحصر ہے کہ زمین پر ہر انسانی قدر مٹ جانے کے بعد بھی انسان باقی رہتا ہے صرف اس یقین کے سہارے فن کار کٹھن تنہائی اور طویل سے طویل خود عائد کردہ جلاوطنی کی ساری اذیتوں کو قبول کر کے انسان کے لیے ایک نئے نظام اقدار کی تلاش میں یولی سس بن کر نکل پڑتا ہے، اس سفر میں وہ انسانی آبادی سے پرے کتنے بھی دور دراز جزیروں میں کیوں نہ نکل جائے لیکن اس کی واپسی ہمیشہ انسانی زندگی کی جانب ہوتی ہے کیوں کہ یہی اس کے سفر کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور غایت ومقصود بھی" (سوغات چوتھا شمارہ)

محمود ایاز کے یہ جملے کسی بھی دور کے ادب اور ادیبوں کے لیے ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چاہے ہمارا سروکار تنقید کے کسی دبستان سے ہو مگر ادب کے بنیادی تقاضوں کا لحاظ کیے بغیر ہم اچھے ادیب نہیں ہو سکتے۔ اس اداریے میں محمود ایاز نے انسانی زندگی اور انسانی قدر کو ادب کا نقطۂ آغاز بھی بتایا ہے اور اس کی انتہا بھی۔ گذشتہ دہائیوں میں ادب اور ادیب کے منصب اور سروکار پر گفتگو کرتے ہوئے اکثر لوگ اپنے نظریے کی نذر ہو گئے۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ لکھنے والے کی ہمدردی اپنے دور کی انسانی زندگی سے نہیں بلکہ اپنے محبوب ادبی نظریے سے ہے۔ ترقی پسند تحریک نے بھی انسانی زندگی کے مسائل اور اس کی تباہ کاریوں کو اپنی نظر سے دیکھا تھا۔

تہذیبی زندگی کے ٹوٹتے شیرازے کو دیکھنے کا مطلب محمود ایاز کے نزدیک وہ نہیں تھا جسے آگے چل کر جدیدیت نے رائج کیا۔ یہاں پر یہ بات دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ آخر کس طرح ایک صبر آزما صورت حال کو ادب کی پراسراریت اور ابہام کی نذر کر دیا گیا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ ہمارے عہد کے دکھوں کا مداوا ادب کی پراسرار فضا میں ہے۔ گرچہ محمود ایاز نے ایسی تحریروں کو بھی شائع کیا جس میں بلا کی پراسراریت تھی لیکن یہ پراسرار فضا جن کو فن کاروں نے پیدا کی وہ اس عہد کے مخلص فن کار تھے۔ اور انھوں نے تنقیدی مضامین پڑھ کر یہ پراسرار فضا قائم نہیں کی تھی۔ مگر بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اس پراسراریت کو اوپر سے اوڑھ رکھا تھا۔ محمود ایاز بار بار اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ نئے مسائل کا حل محض الفاظ کے استعمال میں نہیں تھا۔ اسی اداریے میں ان کا یہ جملہ بھی ہے۔ " اپنی تن آسانی، تہی مائیگی اور یاوہ گوئی کے جواز کے لیے الفاظ اور نعروں کی پناہ گاہ تراشی گئی۔"

سوغات دور" اول کے چوتھے شمارے میں محمود ایاز ایک مرتبہ پھر محمد حسن کے مضامین کی تعریف کرتے ہوئے اسے فکر انگیز قرار دیتے ہیں۔ اس اداریے میں انھوں نے افسانے پر محمد حسن کے ایک تفصیلی مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

" محمد حسن نے افسانوی ادب پر کافی طویل مضمون لکھا ہے... ان کی اس صبر آزما محنت کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی..... انتظار حسین نے Dubliners کے زیر اثر جو افسانے لکھے ان کا محمد حسن نے ذکر نہیں کیا اور نہ اس بات پر توجہ دی کہ انتظار حسین اپنے افسانوں میں اسلامی تاریخ خصوصاً کربلا کے واقعات کو اس طرح لا رہے ہیں کہ وہ ایک عام مسلمان کے اجتماعی لاشعور میں رچے ہوئے معلوم ہوں۔ انفرادی تجربات و احساسات کو وسیع تر معنویت دینے کی خاطر روایات اور اساطیر کے پس منظر میں پیش کرنا کافی عام سہی، لیکن اردو میں انتظار حسین کے ہاں یہ عمل اپنی نوعیت طریقۂ کار اور مقاصد کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔" (سوغات پانچواں شمارہ ص 11)

محمد حسن کے مضمون اور انتظار حسین کے افسانے سے متعلق محمود ایاز کے یہ خیالات یوں تو دو اشخاص سے مخصوص ہیں لیکن انھیں محمود ایاز کے تنقیدی موقف کی روشنی میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ترقی پسند تنقید کا رویہ انتظار حسین کے سلسلے میں عام طور پر منفی رہا ہے محمود ایاز انتظار حسین کے افسانوں کو جس نظر سے دیکھ رہے تھے اس میں بھی انسانی زندگی اور انسانی قدر کا دکھ شامل ہے۔ انتظار حسین کے لیے وہ جس طریقۂ کار اور مقاصد کو ان کی انفرادیت کا نام دیتے ہیں وہ بلاوجہ نہیں ہے۔ اگر وہ یہاں چاہتے تو وہ عام ترقی پسندوں کی طرح انتظار حسین کے لاشعور اور ہجرت کے معاملات کو انسانی زندگی اور سماج کے لیے سودمند نہ بتاتے۔ محمود ایاز نے اپنی تحریروں کے ذریعے ترقی پسندوں کو بھی اجتماعی تجربے اور اجتماعی حافظے اور ادب کے سماجی منصب کو ایک بڑے سیاق میں سمجھانے کی کوشش کی۔ گرچہ انھوں نے کہیں بھی یہ تاثر نہیں دیا کہ میں کوئی محاسب یا راہ بر ہوں۔ محمود ایاز نے یہ سارا کام جس خاموشی کے ساتھ کیا تھا اس کی آواز اب سنائی دیتی ہے۔ محمد حسن نے اگلے شمارے میں خط لکھ کر محمود ایاز کے مقدمات سے اتفاق کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں

" آپ نے میرے مضمون پر جو نوٹ دیا ہے اس کا طریقہ مجھے اچھا لگا اور بعض باتوں پر اس کی روشنی میں میں نے پھر سے غور کیا۔ انتظار حسین کا ذکر

یقیناً اس نئے پہلو سے بھی ہوسکتا ہے۔'' (سوغات چھٹا شمارہ ص 176)

محمود ایاز سوغات کے مشمولات پر اپنے اداریے میں باضابطہ اظہار خیال کرتے تھے۔ وہ تخلیقی ادب کے سلسلے میں معیاری یا غیر معیاری ہونے کا فیصلہ فنی بنیادوں پر کرتے تو ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ انسانی زندگی یا انسانی المیے کا اگر کوئی پہلو اس میں پوشیدہ ہے تو وہ اس کی جانب بھی اشارا کرتے ہیں۔ ممتاز شیریں کے افسانے کفارہ اور ضمیر الدین کے افسانے ''پہلی موت'' پر محمود ایاز نے جو رائے دی ہے اس سے محمود ایاز کے ادبی اور انسانی سروکار کا اظہار ہوتا ہے۔

''ممتاز شیریں کا افسانہ ''کفارہ'' اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا افسانہ ہے۔ اس افسانے کی نیم روشنی، نیم دھندلی فضا کافکا کی کہانیوں کے نیم حقیقی اور نیم مافوق الحقیقی ماحول سے زیادہ دور نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ''کفارہ'' کی علامات زیادہ واضح معین اور ٹھوس ہیں۔ اس افسانے میں ایک ذاتی المیے کو تاریخی اور اساطیری تلمیحات کے تانے بانے میں پھیلا کر گناہ اور کفارے کے مذہبی احساس پر منتج کیا گیا ہے۔ Anaesthesia کے زیر اثر مریضہ کے لاشعور کی پرواز افسانہ نگاری کا پینترا نہیں بلکہ اصلی اور حقیقی شے بن گئی ہے۔'' (سوغات (3) (9) ص 5,6) ضمیر الدین احمد کے افسانے ''پہلی موت'' کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''اس افسانے کا نو عمر لڑکا ابھی اس قابل نہیں ہوا ہے کہ اقوام متحدہ کا منشور پڑھ سکے لیکن اس کے ذہن میں انسانی وقار انسانی ہمدردی اور ظلم کے خلاف بغاوت اور انصاف کی پاسداری کا جو احساس اپنی خام اور اصلی شکل میں موجود ہے وہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور رہا ہوگا اور ہم سب نے زندگی کے مختلف محاذوں پر کسی نہ کسی حد تک اس احساس کو جس طرح قربان ہونے دیا ہے اس کا عکس اس لڑکے کی شکست میں جھلک رہا ہے۔ ایک لڑکے کی شرارت اور سزا کی یہ بظاہر سیدھی سادھی کہانی ایک گہری اور وسیع معنویت کی حامل ہے۔'' (سوغات (3) (9) ص 6)

یہ دونوں اقتباسات بنیادی طور پر ایک سنجیدہ اور باذوق قاری کی تصویر پیش کرتے ہیں، اچھے متن اور فن پارے کو سمجھنے کے لیے بھی ایک خاص ذہنی سطح کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ قاری/ نقاد کی ایماندارانہ قرات ہے۔ ان دونوں اقتباسات میں محمود ایاز نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں انھیں الفاظ کے سہارے ہمارے نقادوں نے کتنی دھاندلیاں کی ہیں۔ نیم حقیقی، مافوق الحقیقی، ذاتی تجربے، تاریخ، اساطیری، تلمیحات جیسی اصطلاحوں کو محمود ایاز نے مکتبی اور سکہ بند نقادوں کی طرح نہیں برتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمود ایاز کی ذہانت متن کے ساتھ سفر تو کرتی ہے لیکن وہ متن سے آگے نہیں نکلتی، ہمارے بیشتر نقادوں کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ ان کی ذہانت اور آگہی متن سے آگے نکل کر خود کو زیادہ سمجھانے لگتی ہے۔ ان کا یہ جملہ ایک دور کی افسانہ نگاری پر گہرا طنز ہے۔ ''مریضہ کے لاشعور کی پرواز افسانہ نگاری کا پینترا نہیں بلکہ اصل اور حقیقی بن گئی ہے۔''

محمود ایاز زندگی اور اس کے ٹھوس حقائق کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں وہ اپنے اور بعد کے دیگر نقادوں کی طرح تجریدیت اور ابہام کو ادب کے لیے مقصود بالذات نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے فن پارے میں کل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ زندگی کے دکھ اور المیے کے اظہار کو فن پارہ بننا چاہیے لیکن یہ المیہ نظریاتی سطح پر تجریدیت اور ابہام کی نذر نہ ہو، نئے افسانے کی تنقید میں تجرید اور اسرار کو بڑے افسانے کے لیے لازمی تصور کیا گیا۔ محمود ایاز نے ضمیر الدین احمد کے افسانے ''پہلی موت'' کے بارے میں یہ بھی لکھا تھا۔ ''افسانہ نگار نے جس بے تعلقی اور سادگی سے یہ ''بے ضرر'' سا افسانہ لکھا ہے وہ قابل داد ہے۔''

سوغات کے ان چند اداریوں کے مطالعے سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

1. محمود ایاز نے نئی حسیت کو ترقی پسندی کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ جہاں ضرورت پڑی وہاں انھوں نے ترقی پسند تحریک کے نظریات سے اختلاف ضرور کیا۔
2. انھوں نے ترقی پسندی کو اپنا ہدف نہیں بنایا اور سوغات میں بعض اہم ترقی پسندوں کو اہتمام اور احترام کے ساتھ شائع کیا۔
3. ذہنی اور تخلیقی آزادی کا مطلب ان کے نزدیک زندگی اور سماج کے تئیں منفی یا غیر ذمے دارانہ رویہ اختیار کرنا نہیں تھا۔
4. نئی حسیت کے علم برداروں اور فن کاروں سے ان کا مطالبہ خالص ادب تخلیق کرنے کا نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ فن کار اس درد کی بھٹی سے گزرے جس کے بغیر ادب صرف لفاظی کا نمونہ بن جاتا ہے۔
5. اگر محمود ایاز کی فکر پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا تو بعد کی جدیدیت زیادہ بامعنی رول ادا کرسکتی تھی۔
6. محمود ایاز نے ہر تجربے کا جواب انسانی زندگی اور سماج میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔
7. ان کے نزدیک ادب میں زندگی کے لایعنی لمحات کی تصویریں مستقل طور پر اہمیت نہیں رکھتیں اور نہ انھیں آئیڈیل بنا کر پیش کیا جاسکتا ہے۔
8. محمود ایاز کے نزدیک ادب میں بنیادی اہمیت تخلیقی تجربے کی ہے چاہے اس کا تعلق طربیہ کیفیات سے ہو یا المیے سے۔ □□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Jamia Millia Islamia,
Jamia Nagar, New Delhi-110025

ف.س. اعجاز

انتقام

برف گر رہی تھی اور ہوا بہت تیز تھی۔ ایسے میں سمت کا تو اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی دُھنیے نے ڈھیر ساری روئی دُھن کر ایک جگہ رکھی ہو اور ابھی ابھی زور کی آندھی آگئی ہو جس نے روئی کے ننھے منے گالے بنا کر فضا میں اڑا دیے ہوں۔

رات اور زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ کبھی بجلی چمکتی تو چیڑ اور شیشم کے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں پر جمی ہوئی برف کی تہہ نظر آجاتی۔ اونچے نیچے ٹیلوں پر بھی سفید چاندی سی چڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک کوندا لپکتا تو برف نیلی نیلی سی اور خوبصورت دکھائی پڑتی۔

ہوا کا رخ بدلتا تو تناور درختوں میں زوردار سرسراہٹ پیدا ہوتی اور سرد لہر سے جسم کانپ کانپ جاتا۔

باہر فضا جتنی بھی ڈراؤنی اور پُر شور رہی ہو، خیموں کے اندر جو فوجی تھے اُن کے لیے تو یہ تفریح کا موسم تھا۔

تیسرے خیمے میں کئی بڑے چھوٹے افسر گپیں لڑا رہے تھے۔ وہ وردیوں میں ملبوس تھے۔ اوپر لمبے اور موٹے کوٹ پہنے، ہاتھوں میں رائفلیں تھامے جیسے کسی اچانک خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہو۔

میجر ساہنی، کیپٹن اجے سنگھ اور لیفٹیننٹ سلیم کونے کی گول میز کے گرد کھڑے ایک نقشے پر پنسلیں پھیرتے ہوئے کسی منصوبے پر باتیں کر رہے تھے۔ سگنل مین، وائرلیس آپریٹر، حولدار اور سرجنٹ وغیرہ بیچ میں آگ کے ڈھیر کے چاروں طرف آلتی پالتی مارے بیٹھے اناپ شناپ بک رہے تھے۔

''یارو! وہ گدھا رامو ابھی تک نہیں لوٹا؟'' ایک فلک شگاف قہقہہ ختم ہونے پر کرن نے کہا۔

''ہاں جب سے کتے کے پلّے کے پیچھے بھاگا ہے اس کی کوئی خبر نہیں۔ دو تین گھنٹے ہو گئے۔'' وائرلیس آپریٹر بولا۔

''تعجب ہے، کتے کے پلّے بھی اغوا کر لیتے ہیں!'' کرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آتا ہی ہوگا۔ برف پڑ رہی ہے نا!'' ایک نے کہا۔

''مجھے تو اس پر بڑا غصہ آتا ہے کرن۔ جانوروں کے پیچھے تو مرتا ہے کم بخت۔ پتہ نہیں جانوروں سے کیا رشتہ ہے اس کا۔'' سرجنٹ رحیم منہ بناتے ہوئے بولا ''تم لوگ شاید نہیں جانتے کہ اس کا گھر اچھا خاصا چڑیا خانہ ہے۔ چڑیا، طوطا، مینا، بلی، خرگوش، مرغی، بطخ کیا نہیں ہے اس کے گھر میں۔ میّا بیچاری رہ گئی ہے جانوروں کی دیکھ ریکھ کے لیے۔ اور صاحب نہ معلوم کیا کشش ہے اس رام میں کہ جانور خود اس کے پاس چلے آتے ہیں!۔ اکثر وہ اپنا کھانا بھی انہی کو کھلا دیتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے تو غلط نہیں کہتا کہ جانور اس کی برادری کے لوگ ہیں۔ کئی لوگوں نے تو تنگ آ کر اس سے دوستی ہی ختم کر دی ہے۔ جانتے ہو جتنا پیار وہ جانوروں سے کرتا ہے اتنا تو ہم انسانوں سے بھی نہیں کرتے!''

''اور شاید کر بھی نہ پائیں۔'' کرن بولا ''اُس روز وہ کہہ رہا تھا'' پرم آتما نے دنیا کو انسان اور حیوان کے ساتھ مکمل کیا ہے۔ سرشٹی اکیلے مانو سے نہیں ہے''۔

''چھوڑو یار جہنم میں جائے وہ۔'' رحیم نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''چلو چائے پئیں۔''

ساور سے گرم گرم چائے ڈونگوں میں بھری گئی اور ہر فوجی کو ایک ڈونگا دے دیا گیا۔

اب باہر برف نہیں گر رہی تھی۔

لوگ ابھی چائے پی رہے تھے کہ کسی کے بوٹوں کی چاپ، برف ٹوٹنے کی چُرمُراہٹ کے ساتھ سنائی دی۔

آنے والا رام تھا، درمیانہ قد، گندمی رنگ، سر پر بال بہت کم، چہرہ گول، کچھ خاص خوبصورت نہ تھا۔ پھر بھی پُر کشش شخصیت تھی اس کی۔ گول مٹول سا جب وہ ایسا لگتا جیسے کوئی انوکھی لیسدار مخلوق آہستہ آہستہ کھسک رہی ہو جو ہاتھوں میں آتے ہی پھسل جائے گی۔

اس نے خیمے میں گھستے ہی پیر پٹخے۔ جب اس نے دیکھا کہ کیپٹن اور لیفٹیننٹ اسے گھور رہے ہیں اور میجر کی خشم ناک نظر اس پر ٹھہری ہوئی ہے تو اس نے ہڑبڑا کر دایاں ہاتھ سیلوٹ کے لیے اُٹھا لیا۔ مگر بایاں ہاتھ بھیگے ہوئے کوٹ کے اندر شاید سینے پر تھا اور ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ اس وقت اس قدر مضحکہ خیز ہو گیا تھا کہ دوسرے فوجیوں کے ساتھ میجر بھی ہنس پڑا۔

رام نے کھیسیں نکال کر چاروں طرف دیکھا اور سیدھا ساور کے پاس چلا گیا۔ ساور سے ڈونگے میں چائے بھری اور ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا جہاں اور کوئی نہ تھا۔ لوگ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اُس کی پشت اُن کی طرف تھی۔

اُس نے دایاں ہاتھ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال کر باہر نکالا اور لوگ یہ دیکھ کر ہنس پڑے کہ اس کے ہاتھ میں ایک بھورے رنگ کا چھوٹا سا کتے کا پلا موجود ہے۔ ایک نظر اس نے انھیں منہ بھلا کے دیکھا اور چسکیاں لے لے کر چائے پینے لگا۔ جب چائے کچھ بچ رہی تو پلّے کا منہ ڈونگے سے لگا دیا۔ پلا سپڑ سپڑ چائے پی گیا اور اپنے منہ پر زبان پھیرتے ہوئے دم ہلا کر رام کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اپنے آقا کی اگلی آواز کا منتظر ہو۔

رام نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے کہا ''گرم کی چائے ہے کلّو، ابھی پھرتی آجائے گی تجھ میں۔''

''اوئے رام! مرتے سے تیری جو جائداد ہو کلّو کے نام کر جائیو'' کرن نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''اوئے کرنے! یہ کلّو بولے تو وہ میں تیرے ہی نام کر جاؤں''۔ رام نے کرن ہی کے لہجے میں جواب دیا۔

آپ کے برادر محترم ہیں کلّو صاحب'' رحیم نے چٹکی لیتے ہوئے کرن سے کہا۔

''اگر تو کتا ہو جائے تو میں تجھے بڑا انسان سمجھوں!'' رام بولا۔

رحیم کی آنکھیں غصّے سے لال ہو گئیں مگر پیچھے میجر وغیرہ بیٹھے تھے اس لیے وہ چپ رہا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد میجر، کیپٹن اور لیفٹیننٹ اور کئی سپاہی اپنے اپنے خیموں میں سونے یا اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔ اب اس خیمے میں آٹھ دس فوجی تھے گیس برنر بجھا کے لالٹین جلا دی گئی۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ سب خراٹے لے رہے تھے۔ مگر رحیم کی آنکھیں بار بار کھل جاتی تھیں کیوں کہ باہر بجلی رہ رہ کے کڑک رہی تھی۔ کبھی آنکھ لگ جاتی تو رام کا پلا اپنی پیاؤں پیاؤں سے اُسے پھر جگا دیتا۔ رحیم منہ بنا کر رام کو گھور کے رہ جاتا۔ اس کا جی چاہتا وہ رام کو اس کے پلّے سمیت خیمے سے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ ایک دفعہ تو وہ چلّا ہی اٹھا۔ ''ابے کتّے کو باہر کرنا......''۔

رام جاگ تو رہا تھا مگر رحیم کی دہاڑ سن کر جھوٹ موٹ خراٹے لینے لگا۔

رحیم کے جی میں آئی کہ وہ کتّے کو خود باہر پھینک دے مگر اس نے سوچا کہ وہ کتّے کے گلیلے جسم کو چھوئے گا کیسے، قے نہیں ہو جائے گی؟۔ یہ دیکھ کر کہ رام سو رہا ہے اُس نے اُسے زیرِ لب گالی دی۔ سؤر کا بچہ، کمینہ۔

پھر وہ سو گیا۔

اُدھر رام جاگ رہا تھا۔ اُسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ کہیں رحیم سے جھگڑا نہ ہو جائے اِس کلّو کے پیچھے۔ اپنے سونے کے لیے تو ذرا سی جگہ ملی تھی مگر کلّو کو بہر حال اچھی طرح اور آرام سے سلاتا تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ سرگوشی میں کہتا رہا'' دیکھ کلّو کہنا مان۔ شور مت کر۔ ابے تو جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ برف میں کہیں دب دبا جاتا۔ میں تجھے یہاں لے آیا۔ اب کہیں تُو مجھے بھی نہ نکلوا دیجو یہاں سے، یہ لوگ تو پہلے ہی خار کھاتے ہیں مجھ سے اور یہ رحیم ہے نا میرے ساتھ کھیلا ہے، پڑھا ہے، میرا دوست تھا کبھی۔ ایسا ویسا نہیں، جگری دوست۔ مگر میں تم جیسوں سے اتنا پیار کرتا ہوں تو یہ مجھ سے نفرت کرنے لگتا ہے''۔

اور پلّے نے جیسے اس کی معصومیت کی داد دی ہو یا ہاں میں ہاں ملائی ہو۔ اتنے زور سے تو چلّایا ہی تھا کہ رحیم کی نیند ٹوٹ جاتی!۔

رحیم اٹھ بیٹھا۔ غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ دونوں بھنوؤں کے بیچ اس کی موٹی سی نس پھڑکنے لگی تھی۔ وہ تیزی سے پلّے کے پاس گیا۔ اسے ایک زوردار لات مار کے خیمے کے پردے تک پہنچا دیا۔ پھر پردے کے پاس جا کر ایک لات اور رسید کی اور پلا چیں چیں کرتا خیمے کے باہر ——!

''ابے آدمی تین سو سال چین سے پڑے سوئے رہیں جو کتا پریشان نہ کرے۔ جب دیکھوں بھوں بھوں پیاؤں پیاؤں، تیری ایسی کی تیسی......'' وہ بڑبڑایا۔

مگر اب رام سے بھی برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ لات کلّو کے نہیں بلکہ اس کے لگی ہے۔ وہ اٹھا اور سیدھا پردے سے باہر جا کر پلّے کو اٹھا لیا۔ رومال سے اس کے جسم سے کیچڑ صاف کر کے اسے پچکارتے ہوئے خیمے میں دوبارہ داخل ہوا۔

''اُلّو کے پٹھے! تو اس صورت حرام کو باہر کرتا ہے کہ نہیں؟'' رحیم نے غصّے سے چلّا کر کہا۔

''ذرا اپنی صورت بھی تو دیکھ۔ لگتا ہے پیشاب میں بھیگی ہوئی بکری کی مینگنی جو سوکھ کر شق ہو گئی ہو۔'' رام کے ان الفاظ پر رحیم جل بھن گیا۔ اس کی مٹھیاں اور دانت بھینچ گئے۔

''تو اُسے باہر کرتا ہے یا بتاؤں؟'' رحیم اس پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے چیخا۔

''کتّے کی طرح تو تو چیختا ہے یار!۔ مگر میں اسے باہر نہیں کروں گا!'' رام نے اڑیل ٹٹو کی طرح جواب دیا۔

''بدھشٹر کی اولاد، جا اپنے کتّے کے سنگ سؤرگ میں!''۔ رحیم نے دانت پیس کر پورے جسم کا زور صرف کرتے ہوئے رام کو دھکیل کر خیمے سے باہر کر دیا۔

باہر برف باری زوروں پر تھی۔ پلا رام کے ہاتھ سے دور جا پڑا۔ رام نے اُسے پھر اٹھا لیا۔ اس بار رحیم نے باہر نکل کر رام کے اڑنگا دیا۔ رام کیچڑ پر

پھسلتا چلا گیا۔ اس کا سیدھا پاؤں خیمے کی ان رسیوں میں جا پھنسا جو لوہے کی کھونٹی سے بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے ایک دل دہلا دینے والی چیخ نکلی مگر وہ بجلی کی کڑک میں دب کر رہ گئی۔

دوسری چیخ پلے کی تھی۔ اس چیخ کو رحیم نے سنا تھا۔

رام لنگڑاتا لنگڑاتا خیمے میں آیا اور اپنی جگہ جا کے لیٹ گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

رحیم کو اطمینان کی نیند آ گئی تھی کیونکہ پلا جو مر گیا تھا!!

صبح رام بے ہوش پایا گیا۔

رحیم سہم گیا، کہیں میجر کو خبر نہ ہو جائے کہ رام کو اس نے مارا ہے۔ مگر اُس کا خوف دور ہو گیا جب ہوش میں آنے کے بعد رام نے یہ بیان دیا: ''رات کو میں پیشاب کرنے اٹھا تھا۔ باہر کیچڑ میں میرا پاؤں پھسل گیا اور رسیوں میں جا پھنسا۔''

اس کے دائیں پاؤں کی ہڈی گھٹنے کے پاس سے ٹوٹ گئی تھی۔

کچھ دنوں بعد اسے ہیلی کوپٹر کے ذریعے دہلی کے ملٹری ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔

چلتے وقت رام نے رحیم سے سرگوشی میں کہا تھا ''میں نے بیان غلط دیا ہے۔ مگر میں بدلہ ضرور لوں گا اور خود انتقام لینے کے لیے ہی تو میں نے غلط بیان دیا ہے!''۔

''جا کتے!''۔ رحیم نے بظاہر سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔ ''تیری کیا مجال ہے جو تو......''

چھ مہینے گذر گئے۔

رام کا دایاں پاؤں گھٹنے تک کاٹ دیا گیا تھا۔ اب وہ اپاہج تھا۔

جس دن اس کی ٹانگ کاٹی گئی اس دن وہ بہت رویا۔ کیونکہ شروع ہی سے اس کی آرزو تھی کہ وہ فوج میں رہ کر دیش کی خدمت کرے۔ میجر، جنرل، کرنل اور بڑے سے بڑے عہدے پائے۔

''آج میرے ارمان میری امنگیں، میری جوانی اور جوش، میرا سب کچھ چھن جائے گا اس ٹانگ کے ساتھ! اُف بھگوان! لوگ مجھے لنگڑا کہیں گے۔ دنیا کے سب قافلے تیز تیز مجھ سے آگے نکل جائیں گے۔ میں اپنی قسمت کو روؤں گا۔'' اسے اس طرح روتا دیکھ کر بیچاری نرس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اب اسے بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑا۔ جلد ہی اسے اس کی بیوہ ماں کے پاس بھیج دیا گیا۔

اسپتال کے کمپاؤنڈ سے اپنے ساتھ وہ ایک نیا دوست لے کر چلا تھا۔

ایک نیا کالا سفید پلا!

اس نے اپنی اس ضد پر کبھی غور نہیں کیا لیکن دل میں ٹھان رکھی تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی رحیم سے بدلہ ضرور لے گا جو اسی کی بستی کا رہنے والا تھا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ ایک دن وہ رحیم کے گھر پہنچا۔

بے دھڑک بیساکھی کی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے پلنگ پر بیٹھا ایک مریض ڈاکٹر سے کچھ ناقابل فہم سی باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ سر پر بال نہیں تھے۔ سر اور چہرہ آگ میں جھلسنے کی وجہ سے سفید اور کتھئی پڑ گیا تھا اور جا بجا گوشت کی پپڑیاں جم گئی تھیں، ناک نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک غار سا نظر آتا تھا۔ آنکھوں پر کالے شیشوں کا چشمہ اور ماتھے پر بنڈیج بندھا ہوا تھا۔

اُس کی صورت اِس قدر بگڑی ہوئی تھی کہ کوئی نرم دل اس کو دیکھتا تو رو پڑتا یا ڈر کے بھاگ جاتا۔ اُسے دیکھ کر رام کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی اور رعشہ طاری ہو گیا۔

رام نے ڈاکٹر سے پوچھا ''یہ رحیم کا گھر نہیں ہے کیا؟۔ کیا میں کسی غلط جگہ آ گیا ہوں؟''۔

ڈاکٹر بجائے جواب دینے کے اسے خاموشی سے گھورنے لگا۔ مریض نے رام کی طرف چہرہ کیا اور خرخراتی آواز میں بولا۔

''تم انتقام لینے آئے ہو نا؟ —— تم مجھے نہیں پہچانتے''۔ وہ گویا مریخ سے اتری کسی اجنبی مخلوق کی طرح بول رہا تھا ''دیکھو نا میری صورت ایسی ہے جیسے پیشاب میں بھیگی ہوئی بکری کی مینگنی جو سوکھ کر شق ہو گئی ہو............ تم سے پہلے............ اوہ............ قدرت نے مجھ سے انتقام لے لیا۔ میرے اکلوتے بھائی نے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کو اکیلے ہضم کرنے کے لالچ میں کھیت میں اپنا ٹریکٹر مجھ پر چڑھا دیا۔ کریم خود تو جیل چلا گیا لیکن میرا یہ حال کر گیا۔ آج لوگوں کو مجھ سے گھن آتی ہے —— کوئی میرے پاس نہیں آتا۔ کوئی مجھ سے دلار نہیں کرتا۔ تم انتقام لے لینا دوست...... مگر...... اس سے پہلے مجھے تھوڑا پیار ضرور دے دینا۔ وہی پیار جو تم اپنے کسی کتو کو دیتے ہو۔ میں جانتا ہوں صرف تم ہی مجھے پیار کر سکتے ہو......''

رام کے پیروں تلے سے زمین ہی تو نکل گئی! وہ چیخا ''رحیم بڑا غضب ہوا...... بڑا غضب ہوا رحیم!''

دوسرے لمحے وہ رحیم کے سرہانے پہنچنے کی کوشش میں لڑکھڑا گیا۔ بیساکھیاں گر کر دور جا پڑیں۔ اُس کے کوٹ کی بڑی جیب سے ایک کتے کا پلا اچھل کر نکلا اور اپنے دانتوں سے ایک بیساکھی کھینچ کر لانے لگا۔ □□□

پتہ:
Editor "Insha",25B, Zakaria Street, Kolkata - 73

ندا فاضلی

سنسار کے بازار میں

بڑھتی ہوئی آبادی نے سنسار کو ایک بڑے بازار میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس بازار نے صدیوں پرانے عقیدوں، یقین اور احساسوں پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے، اس کی مول تول کی ترازو کا دور دور تک کوئی رشتہ سماجی اخلاقی قدروں سے نہیں ہوتا۔ اس کی زبان، رسم و رواج، اصول، کام کاج سب بازاری ہوتے ہیں۔ اقتصادی نقصان فائدے کے گھیروں میں گھومتی یہ نئی تہذیب آج زندگی کے ہر میدان میں داخل ہو چکی ہے۔ سیاست، مذہب، ادب، رشتے ناطے، تعلیم سب اسی شطرنج کے چھوٹے بڑے مہرے ہیں، ایک زمانے میں (سوویت یونین کے زوال سے پہلے) امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی. آئی. اے. اس طرح کام کرتی تھی کہ اس سے جڑے کارکنوں کو بھی یہ معلوم نہیں پڑتا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہے ہیں، یہی حال آج کے سماج کا ہے۔ یہ بازار کیسے کیسے اور کہاں کہاں تک پھیل چکا ہے اس کی جانکاری نہ ان کو ہے جو اس کے زیر اثر ہیں، نہ ان کو، جو اس کے پھیلاؤ میں مددگار ہیں، اس بازاری تہذیب کے نشان ہر کہیں دکھائی دیتے ہیں۔

میرا تعلق مدھیہ پردیش کے ایک چھوٹے سے شہر گوالیار سے ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا وہاں کا مزاج تھا۔ ایک گھر کی خوشی، کئی کئی گھروں میں دنوں ناچتی گاتی تھی، اسی طرح ایک مکان کی غمی ایک ساتھ بہت سے گھروں کو رلاتی تھی۔ اسٹیشنوں یا بس اڈوں پر کھڑے تانگے والے، دو تین نسلوں کے بعد بھی مسافروں کے مکانوں یا ان کے رشتے داروں کے ٹھکانوں کو جانتے تھے۔ گھر پہنچنے سے پہلے مسافروں کو راستوں میں ہی نہ صرف اپنے گھر کی بلکہ اور بھی کئی گھروں کی خبریں مل جاتی تھیں۔ جب کوئی نیا گھر بنوایا جاتا تھا تو اس میں خود رہنے کے آرام کی سہولت ہی نہیں، بہت سی دوسری چیزوں کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ اس میں مہمانوں کے ٹھہرنے کو مہمان خانہ بھی ہوتا تھا، جانوروں کی پیاس کے لیے پتھر کی ناند بھی گڑھوائی جاتی تھی، پرندوں کے لیے چھتری بھی لگائی جاتی تھی، ہر گھر کے نقشے میں یہ ساری چیزیں ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ بچوں کی مسکراہٹوں میں سب کی حصہ داری ہوتی تھی، بزرگوں کی عزت واحترام میں سب کی رشتے داری ہوتی تھی:

> دکھ میں نیر بہا دیتے تھے، سکھ میں ہنسنے لگتے تھے
> سیدھے سادے لوگ تھے لیکن کتنے اچھے لگتے تھے

یہ ان دنوں کا گوالیار تھا، جب میں نے اسے چھوڑا تھا، اب وہاں بھی راستوں میں بھیڑ کی ریل پیل نے نئی نئی کالونیوں میں بنے فلیٹوں سے دالان اور آنگن چھین لیے ہیں۔ چھوٹے ہوتے گھروں نے دل کو بھی چھوٹا کر دیا ہے۔ اب نہ چھتوں پر کبوتروں کی چھتریاں نظر آتی ہیں نہ پیاسے جانوروں کے لیے پانی کی ناند رکھی جاتی ہے۔ مہمان اب بھگوان نہیں ہوتا، اس کے آنے سے میزبان پریشان ہوتا ہے۔ اب نہ منڈیروں پر آ کر کوے آنے والوں کو پیغام سناتے ہیں، نہ پیپل اور نیم موسم کے استقبال میں لہلہاتے ہیں۔ گھروں کے بزرگ بے کار سامان کی طرح، ہر جگہ بکھرے بکھرے نظر آتے ہیں۔ تبدیل ہوتی یہ چھوٹی بستیاں آہستہ آہستہ اس اور جا رہی ہیں جہاں ممبئی، چنئی اور دہلی پہنچ چکے ہیں۔ پھیلتے ہوئے بازار کی سب سے بڑی طاقت پبلی سٹی ہے۔ پبلی سٹی میں وزن اور وشواس پیدا کرنے کے لیے سماج کے مختلف علاقوں کے جانے پہچانے چہروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کرکٹ اور فلموں کے مقبول چہرے سڑکوں کی دیواروں پر لگے پوسٹرس، چوراہوں اور ٹنگے ہورڈنگس، اخباروں اور ٹی وی کے اسکرین پر چلتی پھرتی تصویریں رات دن انسانوں کے دماغوں کو ذاتی سوچ سے دور کر کے انھیں جانی پہچانی چیزوں کی اور متوجہ کرتی رہتی ہیں۔ تجارت میں پبلی سٹی کی ضرورت نے اسے ایک انڈسٹری کی صورت دے دی ہے، اس انڈسٹری کے تین چوتھائی سے زیادہ مالکوں میں امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی گنتی ہوتی ہے۔

آج کل ہر بدن پر موٹے کپڑے کی کالی یا نیلی جینس دکھائی دیتی ہے۔ میڈیا کے مسلسل پرچار پرسار نے ساری دنیا میں اسے نوجوانوں کا پسندیدہ لباس بنا دیا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے لیبلوں سے ان کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ یہی موٹا رف کپڑا اگر تیس چالیس سال پہلے کوئی باپ اپنے بیٹے کو دکھاتا یا اس کے لیے اس کی پینٹ بنواتا تو باپ بیٹے کے بیچ تنازعہ کھڑا ہو جاتا، وہ گھر چھوڑ کر جانے کا غصہ دکھاتا اور باپ اس کی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے کوئی دوسرا اچھا ملائم کپڑا خرید کر لاتا، لیکن پرچار پرسار کے بازار نے کل کی ناپسند کو آج کی پسند بنا دیا ہے۔ آج کل کرکٹر میدان میں کھیل کم دکھاتے ہیں، بازار میں تیل، صابن یا سائیکلیں بیچتے زیادہ نظر آتے ہیں۔ سنی دیول ایک طرف فلم میں دیش بھگتی کا جھنڈا لہراتے ہیں دوسری طرف انڈر ویر۔ بنیان کے 'اندر کی بات' بتاتے ہیں۔ عامر خاں فلم 'سرفروش' میں وطن دشمنوں پر بندوق چلاتے ہیں اور ٹی وی اسکرین پر دیسی پانی کے بدیسی روپ کو ٹھنڈا یعنی کوکا کولا کہہ کر

پیسہ کماتے ہیں۔ امیتابھ بچن سر کے تیل سے، لکھنے والے پین تک دکان میں اپنی فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ جگمگاتے ہیں:

حسن والوں کے طلب گار ہیں اچھے اچھے
مال اچھا ہے، خریدار ہیں اچھے اچھے

جب تندولکر ہیرو ہونڈا، اکشے کمار شراب اور ایشوریہ رائے لکس صابن بیچیں گی، تو مارکیٹ میں گاہکوں کی بھیڑ بڑھے گی ہی۔ فلم اور کھیل کی دنیا کے جانے پہچانے ان چہروں کی کاروباری اہمیت کو دیکھ کر سیاست نے بھی انھیں چناؤ میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ بڑی بڑی رقمیں دے کر، ان میں کسی کو سیکولر کانگریس وادی بنایا جاتا ہے، کبھی کسی کے ماتھے پر تلک لگا کر اسے ہندتوا کا سبق پڑھایا جاتا ہے اور کبھی اس کے نام پر سماج وادی کا ٹھپا لگایا جاتا ہے اور اس طرح لوگوں کی سوچ سمجھ کو بجھایا جاتا ہے:

کوئی کسی کی طرف ہے، کوئی کسی کی طرف
کہاں ہے شہر میں اب کوئی زندگی کی طرف

سیاست جو کبھی جن سیوا کا نام تھی اب دھندا بن چکی ہے اور دھندوں کے قاعدے قانون اپنے ہوتے ہیں، یہ کبھی سنت نرسی مہتہ اور گاندھی کے مقامات میں ہنسا کا شور مچاتی ہے، کبھی صوفی سنتوں کی راجدھانی دہلی میں گرونانک کے وانیوں کو خون میں نہلاتی ہے۔ اسامہ بن لادین کو پہلے روس کے خلاف ہتھیار بناتی ہے، پھر اسی کی کھوج میں افغانستان پر بم اور میزائیل اڑاتی ہے اور کبھی زہریلے ہتھیاروں کی جھوٹی گواہیوں پر ہنستے گاتے عراق میں ہر طرف موت بچھاتی ہے اور اس غیر انسانی کھیل کو امن کی ضرورت ٹھہراتی ہے۔

امریکہ میں پریسیڈنٹ کے چناؤ کے دنوں میں، میں وہیں تھا، بُش اور کیری کے چناؤ بھاشن سن کر وہاں کا پڑھا لکھا سماج بش کے مقابلے میں کیری کی دلیلوں اور عراق میں امریکی پالیسی کے خلاف اس کے انسانی نقطۂ نظر کو زیادہ پسند کر رہا تھا، لیکن انھیں شاید اس پبلی سٹی کا علم نہیں تھا جو امریکہ کے غیر تعلیم یافتہ سماج میں (جو بھارت کی طرح تعلیم یافتہ سماج سے کئی گنا زیادہ ہے۔) آہستہ آہستہ بش اور صدام حسین کے ٹکراؤ کو مذہبی جنگ بنا رہی تھی۔ اس غیر انسانی عمل کو جب عیسائیت اور اسلام کی جنگ بنا دیا گیا، تب کیری کی کمزور پبلی سٹی بش کے مضبوط پینتروں کے سامنے گھٹنے ٹیک گئی۔ جنگ میں مارے گئے بیٹوں کی مائیں اب آنسو بہا رہی ہیں، جوان سہاگنیں اپنی بے سہارا تنہائیوں کو رلا رہی ہیں اور واشنگٹن کی سفید عمارت دنیا کو امن اور مذہبی رواداری کا سبق پڑھا رہی ہے۔ ممبئی میں میرے گھر پچھلے کئی برسوں سے ایک مراٹھی عورت جھاڑو پونچھا اور برتن صاف کرنے آتی ہے، اس کے ساتھ ایک بچی بھی ہوتی ہے جو ایک کونے میں بیٹھی ماں کو کام کرتے دیکھتی رہتی ہے۔ وہ بھی دو تین سال بعد اپنی ماں کی طرح ڈھائی تین سو روپئے ماہانہ پر کسی دوسرے گھر میں جھاڑو پونچھا کیا کرے گی۔ میرے گھر میں کام کرنے والی شیوسینا پرمکھ بال ٹھاکرے کی معترف ہے۔ ایک دن جب وہ ووٹ دے کر آئی تو میں نے پوچھا کس پارٹی کو ووٹ دیا؟ اس لیے کہ وہ مراٹھی لوگوں کی پارٹی ہے، اس بے چاری کو کیا معلوم، اس کی پگار ڈھائی تین سو سے آگے نہیں بڑھے گی اور ممبئی، شیواجی، مراٹھا کا پرکشش نعرہ چار سو بیس کروڑ روپیوں میں کوہ نور مل کا سودا طے کرے گا۔ اکبرالہ آبادی کا شعر، تھوڑا سا بدل کر:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں وہ جام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

آج کی تہذیب دکانوں کی تہذیب ہے۔ دکانیں چلانے والوں کا رشتہ کسی خاص مذہب، زبان یا علاقے سے نہیں ہوتا۔ ان دکانوں پر لگے بورڈ مارکیٹنگ کے حساب سے تیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی فرقہ پرست ہے نہ سیکولر، سب دکان دار ہیں اور ان کے اپنے اپنے برانڈ کے محافظ پرچار پرسار ہیں۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی کے بھید بھاؤ میں عوام کو الجھایا جاتا ہے اور ان الجھاووں سے دھندا چلایا جاتا ہے۔ آسکر وائلڈ نے کہا تھا "مقبول ہونے کے لیے چھوٹے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے" میں اس میں اتنا جوڑنا چاہوں گا، چھوٹے ذہن کو اپنا بنانے کے لیے بڑی پبلی سٹی کی ضرورت ہوتی ہے:

ملتا کہاں ہے اپنے مکانوں میں اب خدا
شاید دکھائی دے وہ کسی اشتہار میں

□□□

پتہ:
201-B, Sunrise,
Aaram Nagar Versova, Mumbai-61

گزارش

ماہنامہ "اردو دنیا" اور
سہ ماہی "فکر و تحقیق"
کے قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نگارشات صاف، خوشخط یا کمپوز شدہ بھیجیں۔ تحریر گنجلک ہونے کی صورت میں اس کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔

انور ادیب

چند بین الاقوامی تنظیمیں

بچو! میں تمھیں چند بین الاقوامی تنظیموں کے متعلق بتانا چاہتا ہوں۔ تم نے ان میں سے کچھ تنظیموں کا نام ضرور سنا ہوگا۔ آج میں تمھیں ان کے متعلق کس قدر تفصیل سے بتاتا ہوں۔

ریڈ کراس (Red Cross): قدرتی آفات اور جنگوں میں متاثر لوگوں کی مدد کے لیے 1864 میں جنیوا (سوئزر لینڈ) میں یہ تنظیم قائم کی گئی اور ان ریڈ کراس کا نام دیا گیا۔ ریڈ کراس تحریک کے بانی ہنری ڈونٹ (Hery Dunent) ہیں۔ یہ ایک غیر سرکاری تنظیم ہے جو غیر جانب داری سے جنگ اور قدرتی آفات سے متاثر لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ ہنری ڈونٹ کی یوم پیدائش 8 مئی کو ریڈ کراس ڈے کے طور پر منائی جاتی ہے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھیں انسانی خدمات کے لیے 1901 میں پہلا امن نوبل انعام دیا گیا۔

اس سلسلے میں میں یہ بھی بتادوں کہ انھی مقاصد کی تکمیل کے لیے مسلم ممالک کی ایک تنظیم ریڈ کریسنٹ (لال احمر) کے نام سے کام کرتی ہے۔

یونیورسل پوسٹل یونین (Universal Postal Union): مختلف ممالک کے درمیان ڈاک سروس کو آسان بنانے کے لیے امریکہ نے 1863 میں ایک بین الاقوامی پوسٹل میٹنگ بلائی جس کے نتیجے میں 1874 میں سوئزر لینڈ کے شہر برن (Berne) میں انٹرنیشنل پوسٹل یونین کا قیام عمل میں آیا جس سے 191 ممالک کے درمیان عالمی سطح پر ڈاک کی آمد و رفت آسان ہوگئی۔

روٹری کلب (Rotary Club)۔ پہلا روٹری کلب 1905 میں شکاگو میں پال پی ہیرس (Paul P. Harris) نے قائم کیا۔ ابتدا میں ہفتے کو رکن کے دفتر میں باری باری میٹنگ ہوا کرتی تھی اس لیے اس کلب کا نام روٹری کلب رکھا گیا۔ 1922 میں اسے روٹری انٹرنیشنل کا نام دیا گیا۔ خدمت خلق کی یہ سب سے بڑی عالمی تنظیم ہے۔ اس وقت 189 ملکوں میں 32,000 روٹری کلب قائم ہیں۔

اسکاؤٹ تحریک (Scout Movement): اس تحریک کی بنیاد 1907 میں لفٹنٹ جنرل روبرٹ بیڈن پاول (Robert Baden Power) نے ڈالی۔ اس کا مقصد نوجوانوں کو جسمانی، دماغی اور روحانی طور پر صحت مند بنانا ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی تحریک ہے۔ چونکہ یہ تحریک صرف لڑکوں کے لیے شروع کی گئی تھی اس لیے اس میں لڑکیاں شامل نہیں تھیں۔ 1910 میں ان کے لیے "Girl Guides" کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی گئی۔ اس وقت 216 ممالک میں اس تحریک کے ممبروں کی تعداد 38 ملین ہے۔

لائنز کلب (Lions Club): یہ کلب لائنز کلب انٹرنیشنل کے نام سے مشہور ہے۔ میلون جونس (Melvin Jones) نے 1917 میں امریکہ میں اس کلب کی بنیاد ڈالی۔ اس کا صدر دفتر اوک بروک (Oak Brook) امریکہ میں واقع ہے۔ مختلف ملکوں میں اس تنظیم کے تحت 45,000 کلب قائم ہیں۔ اس کلب کے ذریعے مختلف ملکوں میں انسانی فلاح و بہبود کے مختلف پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت اہم پروگرام آنکھوں کی بینائی سے متعلق ہے۔

انر وہیل کلب (Inner Wheel Club): یہ خواتین کی ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جسے 1923 میں مسز اولیور گولڈنگ (Mrs. Oliver Golding) نے قائم کیا۔ 1969 سے قبل روٹری کلب میں خواتین کو رکنیت نہیں ملتی تھی۔ تب عورتوں کے لیے اس ملک کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت یہ سب سے بڑا عالمی خواتین کلب ہے جس کی رکنیت ایک لاکھ سے زائد ہے۔ یہ تنظیم ایک سو سے زائد ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں پہلا انر وہیل کلب احمد آباد میں 1955 میں قائم ہوا۔

انٹرپول (Interpol): یہ ایک انٹرنیشنل پولس تنظیم ہے جو 1923 میں قائم کی گئی۔ اس کا صدر دفتر فرانس کے شہر Lyon میں واقع ہے۔ اس تنظیم کے 186 ممالک ممبر ہیں۔ اس کا مقصد بین الاقوامی مجرموں کی گرفتاری کے سلسلے میں مختلف ممالک کی پولس کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔

آئی.ایم.ایف. (International Monetary Fund): 185 ممالک پر مشتمل یہ ایک بین الاقوامی مالی تنظیم ہے جس کا قیام 27 دسمبر 1945 کو عمل میں آیا۔ اس کا صدر دفتر واشنگٹن ڈی سی میں واقع ہے۔ اس کا مقصد رکن ممالک کی مالی امداد کرنا ہے۔

ورلڈ بینک (World Bank): 27 دسمبر 1945 کو قائم کیا گیا۔ اس بینک کے 185 ممالک ممبر ہیں۔ اس کا صدر دفتر واشنگٹن ڈی سی میں واقع ہے۔ یہ بینک دو ترقیاتی اداروں پر مشتمل ہے۔ (International Bank for Reconstruction and Development (IBRD) اور

International Development Association (IDA)۔ یہ بینک ان دونوں اداروں کے ذریعے غریب اور ترقی پذیر ممالک کو تعلیم، صحت اور ذرائع ابلاغ کے فروغ کے لیے قرض فراہم کرتا ہے۔

آئی اے ای اے۔ (International Atomic Energy Agency - IAEA): نیوکلیائی (ایٹمی) طاقت کے پرامن استعمال کی نگرانی کے لیے 1957 میں اقوام متحدہ کے تحت ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کا صدر دفتر آسٹریا کے شہر وی آنا میں واقع ہے۔ پہلے اس تنظیم کا نام ورلڈس ایٹمس فار پیس (World's Atoms for Peace) تھا۔ بعد میں اس کا نام IAEA رکھا گیا۔

یوروپین یونین (European Union): یہ یورپی ممالک کی ایک تنظیم ہے جس میں یوروپی ممالک شامل ہیں۔ اس کو 1957 میں قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد اپنے ممبر ملکوں کے درمیان اقتصادی اور سیاسی تعاون کو بڑھانا ہے۔ اس کے عام یوروپی ممالک میں ایک ہی کرنسی رائج کی جسے Euro کہتے ہیں۔

ڈبلیو ڈبلیو ایف (World Wildlife Fund): قدرتی ماحول کی حفاظت اور جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے 1961 میں مشہور ماہر طیور (ornithologist) سر پیٹر اسکوٹ (Sir Peter Scott) نے لندن میں یہ ادارہ قائم کیا۔ یہ ادارہ سو سے زائد ملکوں میں اپنے مختلف منصوبوں پر عمل کرتا ہے۔ اس ادارے کی علامت (Logo) پانڈا (Panda ریچھ کی شکل کا ایک جانور) ہے۔ اس کا صدر دفتر سوئزر لینڈ کے شہر Gland میں واقع ہے۔ 1986 میں اس ادارے کو World Wide Fund کا نام دیا گیا۔

ایمنٹی انٹرنیشنل (Amenty International): یہ ایک غیر سرکاری بین الاقوامی تنظیم ہے جو 1961 میں لندن میں قائم کی گئی۔ اس کے ممبر 150 ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد انسانی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی پر یہ تنظیم احتجاج کرتی ہے اور اسے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔

اوپیک (Organisation of Petroleum Exporting Contries - OPEC): یہ پٹرول برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم ہے جو 1965 میں قائم کی گئی۔ اس کا صدر دفتر آسٹریا کا شہر وی آنا ہے۔ اس کا مقصد پٹرول برآمد کرنے والے ممالک کے مفاد کی حفاظت کرنا اور پٹرول کی قیمت کو کنٹرول کرنا ہے۔ اس میں الجیریا، انڈونیشیا، ایران، عراق، کویت، لیبیا، نائیجیریا، قطر، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، وینیزولا اور اسکوڈر شامل ہیں۔

ڈبلیو۔ ٹی۔ او۔ (World Trade Organisaton (WTO): مختلف ممالک کے درمیان تجارتی ضوابط طے کرنے اور تجارتی تنازعات کو حل کرنے کے لیے 1 جنوری 1995 کو اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا صدر دفتر جنیوا (سوئزر لینڈ) میں واقع ہے۔ اس وقت اس کے ممبران کی تعداد 151 ہے۔

□□□

پتہ:
Ibrahim Manzil
Mosaddi Mohalla, Railpar,
ASANSOL- 713302 (W.B.)

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی و سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت-/33 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد خلیل

جنگلات کا تحفظ — وقت کی اہم ضرورت

ہندوستانی تہذیب میں زمانۂ قدیم سے جنگلات کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ انھی خاموش جنگلات میں صوفیوں اور سنتوں نے مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ موجودہ سائنسی دور میں ہم ان جنگلات کی اہمیت کو بھول چکے ہیں جن پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔ زمانۂ قدیم میں آبادی کم تھی اور جنگلات زیادہ تعداد میں تھے۔ جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہوا جنگلات کاٹے جانے لگے اور ان زمینوں کا استعمال رہائشی مقاصد کے لیے کیا جانے لگا جس کی وجہ سے جنگلات کم ہونے لگے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جنگلاتی علاقے بہت کم رہ گئے ہیں اور دن بدن یہ کم ہی ہو رہے ہیں۔ میدانی علاقوں میں تقریباً 33 فیصد جنگلات ہونے چاہئیں اور پہاڑی علاقوں میں تقریباً 60 فیصد جنگلات ہونے چاہئیں۔ عمارتی اور ایندھن کی لکڑی کے علاوہ ہندوستان میں جنگلات سے لکڑی کی تقریباً تین ہزار قسمیں حاصل کی جاتی ہیں۔ ان سے ادویات، ضروری تیل، گوند، ریزن، ٹینن، فیٹی ایسڈ، رنگ اور کھاد حاصل کیے جاتے ہیں۔

ملک میں زمانۂ قدیم سے ہی صنعتی درخت اگائے جاتے رہے ہیں۔ تقریباً سو سال قبل تک صوبۂ بہار میں ایس فلیکس ڈی فولیس نامی پودے کی پتیوں اور ٹہنیوں سے تیل صنعتی طور پر تیار کیا جاتا تھا۔ آج بھی چائے، کافی اور تمباکو ایسی چیزیں ہیں جو پودوں سے حاصل کی جاتی ہیں اور انھیں ملکی صنعت میں اہم مقام حاصل ہے۔ پنسل، کاغذ، پلائی ووڈ، کھیل کی اشیا، آرائشی اشیا جیسی دوسری متعدد اشیا ہیں جو صنعتی درختوں پر منحصر ہیں۔ کچھ پہلے تک ملک میں پنسل کی صنعت میں استعمال ہونے والی کچھ ملائم لکڑیاں غیر ممالک سے حاصل کی جاتی تھیں لیکن اب اس کی جگہ ملکی پودوں کی لکڑیوں نے لے لی ہے۔

یوکیلپٹس کے درخت کی لکڑی اور بانس کے ٹکڑوں سے آج ملک میں عمدہ قسم کی ریاں تیار کی جاتی ہے۔ املی کے بیجوں سے صنعتی طور پر اسٹارچ (نشاستہ) تیار کیا جا رہا ہے۔ کئی ترقی یافتہ ممالک میں درختوں سے رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔ ان رنگوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ زہریلے نہیں ہوتے اور ان کو استعمال میں لانے سے صحت پر کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ اس طرح یہ رنگ جیلی، جیم، مربا، بسکٹ اور کیک جیسی اشیا میں استعمال میں لائے جا سکتے ہیں۔ ایسے پودے بھی ہیں جن سے کیسر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا رنگ کیسری ہوتا ہے اور اس کی بیرونی ممالک میں کافی مانگ ہے۔ بعض پودوں سے سرخ اور پیلا رنگ حاصل کیا جاتا ہے اور ان رنگوں کا استعمال مٹھائی، ٹافی، کیک وغیرہ میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ربر کی صنعت کو بھی ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ ربر فائی کس ایلاٹیکا نامی پودے سے نکالا جاتا ہے اور اس سے میز پوش، ربر کے کھلونے، دستانے اور اس قسم کی کئی دوسری چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں گوند کا کس قدر استعمال ہے۔ دوسری جانب بیرونی ممالک میں بھی گوند کی کافی مانگ ہے۔ ببول (اکیشیا اریبکا) سے گوند حاصل کی جاتی ہے۔ ایک دوسرا گوند کیترا گوند جو کھانے کے کام میں آتا ہے، ایک عمدہ مقوی غذا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سے زائد ادویاتی پودے پائے جاتے ہیں جو عالمی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً سرپ گندھا (راؤلفیا سرپنٹائنا) اس کی جڑوں سے اسپرین نامی گولی بنائی جاتی ہے۔ لہسن (ایلیم سٹائیوم) سے ایلاسلن نامی گولیاں تیار کی جاتی ہیں جو جراثیم کش ہوتی ہیں۔ ایڈیروڈاولیسا کا نامی پودے سے گلائیکوڈین ٹرپ وسا کا نامی دوا تیار کی جاتی ہے جو ٹھنڈ اور کھانسی میں استعمال ہوتی ہے۔ ایک دوسرا مفید پودا ڈیجیٹیلس پرپوریا، جس سے جراثیم کش ادویہ تیار ہوتی ہیں۔ ایک دوسرا مفید پودا ڈیجیٹیلس پرپوریا جس سے ایسی ادویات تیار کی جاتی ہیں جو قلبی امراض میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح مینتھا پیپر یٹا سے پیپرمنٹ تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دال چینی کی پتی، لونگ، سٹرس کا چھلا اور اس کی پتی، اجوائین، پودینا، صندل کی لکڑی، دیودار کی لکڑی، خس خس، جائفل اور ڈیریس کی جڑوں کی بھی ادویاتی نقطۂ نظر سے کچھ کم اہمیت نہیں۔ جنگلات کے ختم ہونے سے ان کی تعداد میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔

ملک میں جہاں بھی جنگل پائے جاتے ہیں وہاں تیل والے درخت بھی خاصی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، جو ملک کے لیے زرمبادلہ حاصل کرنے کا اہم وسیلہ ہیں مثلاً تارپین کا تیل جو چیڑ کے درخت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر تیل، ساسی نامی درخت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ عطر کی تیاری میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ کیوڑ کا تیل بھی دنیا میں کافی مشہور ہے۔ منتھال کا تیل بھی انھی جنگلات سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا استعمال عطر اور صابن کی تیاری میں بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ اِمبر کی لکڑی کشمیر اور پنجاب کے جنگلات میں پائی جاتی ہے۔ اس کا استعمال پنسل بنانے میں کر سکتے ہیں۔ اس کی پتی کف، بخار اور کھانسی میں نہایت مفید ہے۔ ہلدو کی لکڑی کا استعمال ایندھن کے

طور پر تو ہے ہی لیکن اس کا زیادہ استعمال عمارتی کاموں میں ہوتا ہے۔ ایڈیٹن اس کی لکڑی کی چھیلن سے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ سرس کی لکڑی بھی عمارتی کاموں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی جھڑی ہوئی پتیوں سے اچھے قسم کی کھاد تیار کی جاتی ہے۔ اَملتاس کی چھال سے ٹینن حاصل کیا جاتا ہے۔ تون کی لکڑی (سیڈیلاتونا) گھومنے والے آلات کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال عمارتوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ اس سے پینسل بھی تیار کی جاتی ہے۔ اس کے پھول اُلسر اور پیچش میں مفید ہیں۔ اس کی راکھ بھی کیلشیم سے بھرپور ہوتی ہے۔ دیودار کی لکڑی (سیڈرس دیودار) سب سے قیمتی عمارتی لکڑی اور اس کی ملک میں بیحد مانگ بھی ہے۔ اس کی چھال دست، پیچش، بخار، سردرد میں نہایت مفید ہے۔

جنگلات کی اہمیت ایندھن، کاغذ، ربر، عمارتی یا ادویاتی استعمال تک ہی نہیں ہے بلکہ جنگلات سے، شعاعی ترکیب سے، کاربن ڈائی آکسائیڈ سے آکسیجن کی مقدار میں توازن قائم رہتا ہے۔ سیلاب کو روکنے کے لیے بھی جنگلات بے حد مددگار ہیں۔ جنگلات درجۂ حرارت میں توازن رکھتے ہیں۔ درجۂ حرارت کی تھوڑی سی زیادتی سے حیاتیاتی عمل میں کافی فرق پیدا ہوجاتا ہے اور اس سے کچھ جاندار فوراً ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ جنگلات کا صنعتی ترقی میں ہمیشہ سے ایک اہم کردار رہا ہے۔ آلودگی جو اس صنعتی دور میں بہت بڑھ گئی ہے، جنگلات اس کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ ایسے بہت سے درخت ہیں جو آلودگی کو کم کرتے ہیں۔ ہندوستان میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ گاؤں ہیں جہاں تقریباً سات یا آٹھ کروڑ ٹن ایندھن جلایا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق گوبر کے علاوہ پچاس لاکھ ٹن لکڑی ایندھن کے لیے جنگلات سے حاصل کی جاتی ہے۔ درختوں کو ایندھن کے لیے کاٹنے سے جنگلات ختم ہورہے ہیں اور درختوں کے کٹنے سے تقریباً ساڑھے تین ہزار ٹن مٹی اُڑ کر فضا میں شامل ہوجاتی ہے جس سے قدرتی توازن متاثر ہوتا ہے۔ جنگلات کے کاٹنے سے زمین کی زرخیزی پر بھی اثر پڑتا ہے۔

انسانی زندگی کے سفر کی شروعات جنگلات سے ہوئی تھی، انھی جنگلات کو خود انسان اب ختم کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں لاتعداد صنعتیں ہیں جن کا دارومدار درختوں پر ہے اور ان کے قائم رہنے سے ہمارے قومی سرمایے میں اضافہ ہوگا۔ اس لیے آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ درختوں کے ان خزانوں کو برباد ہونے سے روکا جائے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ جنگلات نہ صرف قائم ہی رہیں بلکہ جنگلات کو بڑھایا جائے تاکہ صنعت اور ماحولیات کو مزید فروغ مل سکے۔

گذشتہ برسوں میں ملک میں کئی کانفرنسیں جنگلات کے تحفظ اور بقا کے مسئلے پر منعقد ہوئی ہیں اور اب عوام بھی درختوں کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہماچل پردیش میں ''چپکو تحریک'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی تھی جس میں عام لوگ درخت کو کاٹنے سے روکنے کے لیے درخت سے چپک جاتے تھے۔ اور درخت کی جگہ خود کو کٹنے کے لیے پیش کرتے تھے۔ یہ مسئلہ ایک بیحد اہم مسئلہ ہے اور اسے صرف قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر حل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ساری دنیا کے جنگلات کی حفاظت کی جاسکے۔

جنگلات کے کٹنے اور کم ہونے سے جانوروں پر بھی خراب اثر پڑا ہے۔ دنیا بھر کے جانوروں اور پرندوں کی کل اقسام میں پچھتّر ہزار صرف ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ جو بتدریج فنا ہورہی ہیں۔ چیتوں کو ہی لیجیے جو صرف ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں وہ ختم ہونے کے دہانے پر پہنچ گئے ہیں۔ ہرن کی کئی قسمیں آج خطرے میں ہیں۔ مُشک آہو (کستوری ہرن) ختم ہوتے نظر آرہے ہیں۔ جنگلاتی جانوروں کے تحفظ کی بھی ضرورت ہے۔ گذشتہ کچھ برسوں میں باگھ، گینڈا، ہرن اور گھڑیال کی کئی قسموں کا تحفظ کرنے میں ہم کامیاب ہوئے ہیں اور ان کی تعداد بڑھی ہے، لیکن اس سلسلے میں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے جن میں سرفہرست جنگلوں کے خاتمے کو روکنا ہے۔

□□□

پتہ:
H-51 Dr. Iqbal Lane, Batla House,
Jamia Nagar,
New Delhi-110025

ہمارا نیا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

جمال نصرت

پانی اور صحت

ہم پانی سے بنے ہیں۔ ہمارے جسم کو پانی کی شدید ضرورت ہے۔ ہر سانس کے ساتھ جسم کا پانی نکل رہا ہے۔ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں، چلتے پھرتے یا دوڑتے ہیں تو ہمارے جسم سے اور بھی زیادہ پانی نکل جاتا ہے، اسے ہم کو برابر پورا کرتے رہنا ہے۔ دنیا میں 71 فیصدی پانی ہے اور 29 فیصدی خشکی ہے اور یہ بھی کتنا بڑا اتفاق ہے کہ ہمارے جسم میں بھی 71 فیصد پانی ہے اور باقی ہڈی، گوشت، پٹھے، دانت اور بال وغیرہ۔ جسم میں سب سے زیادہ پانی پیٹ میں ہے اور سب سے کم دانتوں میں۔ ہمارے جسم کے الگ الگ حصوں کو الگ الگ مقدار میں پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جسم میں پانی کم ہو جائے تو بے ہوشی ہو سکتی ہے۔ کون سا پانی ہمارے جسم کے لیے موافق ہے اور کون سا نہیں یہ بھی ایک ٹیڑھا سوال ہے۔ کوئی پانی کسی آدمی کے لیے موافق ہے اور کسی دوسرے کے لیے ناموزوں۔ اس کی وجہ بہت معمولی ہے کیونکہ کہیں کا پانی کھارا ہے کہیں کا تیزابی اور کہیں کا نارمل۔ پانی کے کھارے پن کو ناپنے کا ایک پیمانہ ہے پی۔ایچ۔ پیمانہ۔ اگر اس پیمانے کی گنتی کسی پانی کے لیے 7 ہے تو یہ پانی نارمل ہے، اگر 7 سے زیادہ ہے تو یہ کھارا ہے اور 7 سے کم رہنے کی صورت میں یہ تیزابی پانی ہے۔ بالکل یہی حال ہمارے جسم کے پانی کا ہے۔ اگر کسی جگہ کا پانی تیزابی ہے اور ہمارے جسم کا بھی پانی تیزابی ہے تو وہاں کے پانی کے استعمال سے ہم کو تیزابیت یا ایسی کوئی Acidity کی شکایت ہوگی اور اس کے برعکس اگر کسی جگہ کا پانی کھارا ہے اور ہمارے جسم میں بھی پانی کی قسم کھاری ہے تو جی متلانے یا گیس کی شکایت ہوگی۔ اگر صورت دوسری ہے یعنی جسم کا پانی کھارا اور جگہ کا پانی تیزابی تو اس آدمی کو اس جگہ کا پانی پینے سے بہت فرحت کا احساس ہوگا۔ اس صورت میں آدمی خوش مزاج بھی ہوگا۔

پانی وہ خاص چیز ہے جو علاج کے لیے دوا کو اپنے میں گھول کر جسم میں جگہ جگہ پہنچا دیتا ہے اور اسی طرح جسم سے بیماری اپنے میں گھول کر جسم کے باہر نکال دیتا ہے۔ ہماری ہڈیوں کے بیچ میں جو شے ہے وہ بھی موٹے طور سے پانی ہی ہے، وہی ان کو طاقت دیتی ہے۔ سو کیلو گرام کی بوری کو ساٹھ کیلو گرام کا آدمی آسانی سے اٹھا لیتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ آتا ہے۔ اگر پانی کم ہو جائے تو آدمی کو اپنا جسم ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں پریشانی ہوگی اور خدانخواستہ یہ پانی بالکل ہی ختم ہو جائے تو ہڈیاں جڑ جائیں گی اور آدمی کا اس حصے کو ہلانا بھی دوبھر ہوگا۔

کوڑا کرکٹ، آلودگی، جراثیم، کیمیائی اجزا وغیرہ بڑی حد تک ہم میں پانی سے اور کھانے سے جاتے ہیں۔ بہت تھوڑے سانس کے ذریعے سے جسم میں جاتے ہیں اور ہم کو بیمار ڈال دیتے ہیں۔ جبکہ یہی پانی تھوک، بلغم، پیشاب، پاخانہ، مواد اور متلی وغیرہ کی شکل میں زہر کو ہمارے جسم سے باہر نکالتا ہے۔

دل ہمارے جسم کا وہ اہم حصہ ہے جو ہماری پیدائش سے پہلے ہی کام کرنا شروع کر دیتا ہے اور مرنے کے بعد بھی، اگر دل نکال لیا جائے اور نئی اور صاف نلکیاں لگا دی جائیں تو یہ پھر سے کام کر سکتا ہے۔ عالمی صحت تنظیم World Health Organisation کا کہنا ہے کہ موت کی سب سے بڑی وجہ دل کی بیماریاں ہیں۔ دل کی بہت سی بیماریاں ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ عام کولیسٹرول کا بڑھ جانا ہے۔ کالیسٹرول کا بڑھنا یا خون لے جانے والی نلکیوں کا راستہ تنگ ہونا ایک ہی بات ہے۔ ان نلکیوں کی دیواروں پر چکنائی جم جاتی ہے اور وہ راستے کو تنگ کر دیتی ہے۔ ان کو لیموں پانی کے استعمال سے کم ہی نہیں کیا جا سکتا ہٹایا بھی جا سکتا ہے۔ یہی صورت جسم کے دوسرے حصوں کی ہے۔ زیادہ جانکاری تو ڈاکٹر ہی دے سکتے ہیں۔

پانی ہمارے دل میں رہ کر اس سے دھڑکنے کا کام لیتا ہے۔ بے ترتیب دھڑکن کی درستی میں پانی کا کردار اہم ہے۔

پانی ہمارے جسم سے زہر نما چیزیں، مواد، الٹی، بلغم، پیشاب، پاخانہ اور تیزاب وغیرہ باہر نکالتا ہے۔

پانی اور خیمے کا سیدھا تعلق ہے۔ پانی نہ ہوگا تو کھانا رکا رہے گا۔ ہضم نہیں ہوگا۔

جب یہ پانی پھیپھڑوں میں ہوتا ہے تو ہوا کے ساتھ آئی گندگی کو باہر نکال دیتا ہے۔ جو بعد میں پیشاب کی شکل میں جسم سے نکل جاتی ہیں۔

ایک خاص درجۂ حرارت کی ہوا کی ضرورت ہمارے پھیپھڑوں کو ہوتی ہے اور یہ پانی ہی مناسب درجۂ حرارت قائم رکھتا ہے۔

اگر ہڈیوں کے بیچ کا پانی کم ہو جائے تو دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ انسان کی لمبائی بھی کم ہو جاتی ہے۔ لمبا ہونا ہے تو پانی پینے کا گلاس بھی لمبا ہو۔

دماغ میں 85 فیصدی پانی ہے۔ دماغی کام کرنے سے، فکروں سے غصے سے یہ پانی اڑ جاتا ہے اور یادداشت گھٹ جاتی ہے جسے پھر پانی پی کر واپس لایا جاتا ہے۔

کچھ معالجوں کا خیال ہے کہ جسمانی بیماریوں جیسے قبض، سردرد، پیٹ کی جلن، گیس، کالیسٹرول، بلڈ پریشر، ہڈیوں کی کمزوری، بچوں کا سوکھا روگ، جلد، تھکاوٹ وغیرہ کی دوسری وجہوں کے ساتھ پانی کی کمی بھی ایک خاص وجہ ہے۔

گردوں کا خاص کام یورک تیزاب، لیکٹک تیزاب اور یوریا کو جسم سے باہر کرنا ہے۔ یہ تینوں ہی پانی میں بہ آسانی گھل جاتے ہیں۔ اس طرح سے ان کا اخراج ممکن ہے۔ اگر جسم میں پانی کم ہوگا تو یہ گردوں میں ہی رک جائیں گے اور دھیرے دھیرے پتھری کی شکل میں ہم کو پریشان کریں گے۔ یہی صورت پتے کی بھی ہے۔ گردے اور پتے کی پتھری کی وجہ، زیادہ عمر، کم چلنا پھرنا، خورد نوش، خاندانی اثر وغیرہ ہیں پھر بھی ان سے بچنے کے لیے ہم کو پانی کی صحیح مقدار لینا چاہیے۔

ہم جس ہوا میں سانس لیتے ہیں اس میں حرارت موسم کے اعتبار سے ہوتی ہے مگر جسم کا پانی اس ہوا کو پھیپھڑوں کی ضرورت اور عادت کے حساب سے موزوں تم اور گرم یا ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ پانی کا سب سے بڑا احسان ہے۔

منہ کا لعاب، کھانے کو پچانے میں مددگار ہے۔ پانی ہی ہماری جلد کو صحت مند اور چمکیلی بناتا ہے

کھانا کھانے سے قبل تھوڑا پانی پیا جاسکتا ہے جیسے 3-2 گھونٹ لیکن کھانے کے آدھے گھنٹے تک بالکل نہیں اور اگر ایک گھنٹے رک سکیں تو اور بھی اچھا ہوگا۔ ہاں صبح، دن، شام اور رات کے ہر حصے میں تھوڑا تھوڑا پانی پیتے رہنا چاہیے۔ صبح کے وقت تو قریب آدھا کیلو پانی پینا بہت ہی فائدے مند ہے۔ پانی نہ تو بہت گرم ہو اور نہ ہی بہت ٹھنڈا، بس صاف ہو اور جسم کے درجۂ حرارت کے قریب ہو یا کچھ ٹھنڈا بھی ہوسکتا ہے۔

ایک دن میں کسی آدمی کو کتنا پانی پینا چاہیے، یہ اس کے مزاج پر منحصر ہے۔ کوئی آدمی پورے دن میں کب کب اور کتنا پانی پیے گا اس کا حساب وہ خود لگا سکتا ہے۔ حساب لگانے میں چائے اور شربت کو بھی پانی ہی مانا جاسکتا ہے۔ ہاں سردی میں جب پسینہ کم نکلتا ہے یا برسات میں جب ہوا میں ہی بہت نمی ہوتی ہے تو اس حساب میں مناسب رد و بدل بھی ہوسکتا ہے۔

پانی کے سلسلے میں اور جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ موٹے طور سے احتیاط کی شکل میں بتایا گیا ہے، یہ کسی ڈاکٹر کا نسخہ نہیں ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پانی ہمارے جسم اور صحت کے لیے سب سے ضروری شے ہے۔

□□□

پتہ:
509/148, Old Hyderabad,
Lucknow-7

عبدالحلیم شرر — بحیثیت ناول نگار

مصنف: علی احمد فاطمی

اس کتاب میں مصنف نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے شرر سے قبل کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے جائزے میں شرر کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر، ملازمتوں اور علمی مشاغل، سفر انگلستان اور قیام حیدرآباد نیز ان کی بعض اہم تحریروں کی اوّلین اشاعت جیسے امور سے تفصیلی بحث کی ہے۔

صفحات: 393، قیمت -/165 روپے

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

اختر انصاری کی یہ کتاب غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل سے بحث کرتی ہے جس میں اردو غزل کے تاریخی و ادبی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت و مقبولیت، اس کے فنی محاسن، غزل کی تنقید اور بتدریج ارتقائی سفر کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہ طور خاص درس و تدریس سے وابستہ افراد کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 231، قیمت -/66 روپے

ایس. مقبول احمد

آم — ہندوستان کا قومی پھل

آم کو ہندوستان کے قومی پھل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش اور فلپائن کا بھی قومی پھل ہے۔ موسم گرما کی آمد کے ساتھ آم کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ آم کی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اسے پھلوں کا راجا کہا جاتا ہے۔ یہ پھل زمانۂ قدیم سے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت، مذہب، آرٹ اور لوک روایات کا جزو لاینفک رہا ہے۔ آم پر اردو اور ہندی میں تو نظمیں اور مضامین لکھے ہی گئے ہیں، سنسکرت اور فارسی میں بھی اس کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ امیر خسرو نے بھی اس پھل کی تعریف کی ہے۔ مرزا غالب کو آم اتنا پسند تھا کہ اس کے حوالے سے ان سے بہت سے لطیفے منسوب ہیں۔ ایک مشہور لطیفے کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ایک بار مرزا غالب اور ان کے ایک دوست بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک گدھا آیا، اس نے راستے میں پڑے ہوئے آم کے چھلکوں کو سونگھا اور چلا گیا۔ مرزا غالب کے دوست کو شرارت سوجھی، انھوں نے کہا: ''مرزا آم ایسا پھل ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے۔'' مرزا نے بیساختہ جواب دیا: ''جی ہاں گدھے آم نہیں کھاتے۔''

آم نے عوام اور خواص سب کے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ مغل حکمراں تو اس کے دلدادہ تھے۔ شہنشاہ اکبر نے بہار کے دربھنگا میں آم کے ایک لاکھ درخت لگوائے تھے۔ یہ باغ ''لکھ باغ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

آم کا سائنسی نام Mangifera Indica ہے اور یہ Anacardianceae خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا انگریزی نام شامل زبان کے 1,000 سے زائد اقسام ہمارے ملک کی مختلف ریاستوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

آم کا درخت بڑا اور گھنی ہری پتیوں سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی نچلی شاخیں افقی طور پر بڑھتی اور پھیلتی ہیں۔ اوپری شاخیں اس وقت تک بتدریج اوپر کی طرف بڑھتی رہتی ہیں جب تک کہ مرکز میں عمودی طور پر کھڑی نہ ہو جائیں۔ اس کی پتیاں سخت، لمبی اور پتلی ہوتی ہیں۔ آم کے درخت کی لمبائی 35 تا 40 میٹر ہوتی ہے۔ اس کے پتے سادہ قسم کے 35-15 سنٹی میٹر لمبے اور 16-6 سنٹی میٹر چوڑے ہوتے ہیں۔ پھل پکنے میں 3 تا 6 ماہ لگتے ہیں۔

آم کے لیے خشک اور گرم موسم کے ساتھ سال بھر میں 75 سے 375 سنٹی میٹر بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ آم کے درخت کو کسی بھی مٹی میں لگایا جاسکتا ہے۔ البتہ مٹی گہرائی تک ہونی چاہیے تاکہ اس کی جڑ اندر تک جاسکے۔ زمین میں بیج ڈال کر یا قلم لگا کر آم لگایا جاسکتا ہے۔ قلمی آم کا درخت پانچ سے سات سال تک پھل دینا شروع کر دیتا ہے اور پچاس سال تک پھل دیتا ہے۔ بیج سے تیار ہونے والا آم کا درخت تقریباً دس سال کے بعد سے پھل دینا شروع کرتا ہے اور 100 سال تک پھل دیتا ہے۔

آم عام طور سے گرمی میں ہی پیدا ہوتا ہے لیکن اس کی کچھ اقسام پورے سال دستیاب رہتی ہیں۔ آم کا موسم شروع ہوتے ہی اس کے درختوں کی شاخوں پر بڑی تعداد میں سفیدی مائل بھورے پھول (بور) آجاتے ہیں جن کی خوشبو سے پورا ماحول معطر ہو جاتا ہے۔ موسم خراب ہونے، بجلی کڑکنے، تیز ہوا اور بارش کی وجہ سے بور گر سکتے ہیں۔

بور آنے کے چار سے پانچ ماہ کے بعد آم کا پھل پکنا شروع ہوتا ہے۔ آم کا موسم مختلف علاقوں میں الگ الگ ہے۔ مثال کے طور پر مغربی ہندوستان میں اس کی فصل اپریل، مئی میں تیار ہوتی ہے۔ ممبئی اور دکن میں مئی جون میں، مالابار میں فروری مارچ میں، آندھرا پردیش کے ساحلی علاقوں میں اپریل سے جولائی تک، کرناٹک اور رائلسیما میں مئی سے اگست تک، شمالی ہند میں جون سے اگست تک اور مغربی بنگال میں جون میں آم پکتا ہے۔

ہندوپاک اور بنگلہ دیش کے علاوہ چین، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، میکسکو، فلپائن، برازیل اور ویتنام میں بھی آم کی پیداوار ہوتی ہے لیکن ہندوستان کو اس کی پیداوار میں اولیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں 16,000 مربع کیلومیٹر رقبے میں اس کی پیداوار ہو رہی ہے۔ دنیا بھر میں آم کی پیداوار ایک کروڑ آٹھ لاکھ ٹن ہوتی ہے۔ اس میں ہندوستان کی پیداوار 57-58% ہے۔ آم کی پیداوار میں آندھرا پردیش کا پہلا مقام ہے۔ اس کے بعد اتر پردیش، بہار، مہاراشٹرا، مغربی بنگال، گجرات اور کرناٹک ہیں۔

آم کے پھل کا انحصار اس کی قسم، مٹی کی نوعیت اور موسم کی صورت حال پر ہوتا ہے۔ دس سال کے درخت پر اوسطاً 300 تا 500، 15 سال کے درخت پر 1500 تا 2000 اور 20 سال سے زیادہ کے درخت پر 5000 پھل لگتے ہیں۔ فی 100 گرام آم کے پھل میں 74 K-cal (کیلو کیلوری) توانائی کے علاوہ کیلشیم، پوٹاشیم، فاسفورس، آئرن، حیاتین کیروٹی نائیڈس اور اینٹی اکسی ڈینٹس پائے جاتے ہیں۔ غذا کو ہضم کرنے میں مدد دینے والے خامرے (Enzymes)

جیسے Magiferin اور Lactase بھی ان میں پائے جاتے ہیں۔

آم کی تغذیائی قدر حسب ذیل ہے:
(فی 100 گرام آم میں پایا جاتا ہے)

لحیات (Proteins)	0.6
چربی (Fats)	0.4
ریشے (Fibres)	0.7
معدنیات (Mineral NUtrients)	0.4
نشاستہ (Carbohydrates)	16.9
توانائی (K.cal) (Energy)	.74
حیاتین 'سی' ('c' Vitamin) (mg)	22.10
بیٹا کیروٹین (B-carotene) (mg)	19.90
پوٹاشیم (Potassium)	205
سوڈیم (Sodium)	26
کیلشیم (Calcium)	14
لوہا (Iron)	1.3
فاسفورس (Phosphorus)	16

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آم کے درخت صوتی آلودگی (Sound Pollution) روکنے میں مدد کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کو سڑکوں کے دونوں جانب لگایا جاتا ہے۔ آم کے بے شمار فوائد ہیں جن میں سے چند کا ذکر مندرجۂ ذیل سطور میں کیا جارہا ہے۔

آم کی مختلف اقسام سے شربت، اچار، چٹنی، مٹھائیاں، جیلی (Jelly) اور امچور (امی) وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔ کچے آم کا مشروب لو لگنے پر مفید ہوتا ہے۔ آم کی چھال اور جڑوں سے Mangiferin نامی کیمیائی مادہ حاصل ہوتا ہے۔ جو سرطان (Cancer) کی نشوونما کو روکتا ہے۔ پکے ہوئے آم کے گودے سے انواع واقسام کے مشروبات تیار کیے جاتے ہیں جو ہر عمر کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ آم خون میں پائے جانے والے کولیسٹرول (Cholestrol) کی مقدار کو کم کرتا ہے۔ آم کا ریشے دار حصہ ہاضمے کے لیے مفید ہوتا ہے۔ آم جسم میں قوت مدافعت (Resistance Power) پیدا کرتا ہے۔ آم پیشاب آور ہوتا ہے۔ آم کا پھل سرطان اور قلب کی بیماریوں کو روکنے میں مدد کرتا ہے۔ آم کی گٹھلی بھی بے حد مفید ہوتی ہے۔ اس کا سفوف چھوٹی موٹی پیٹ کی بیماریوں میں مفید ہوتا ہے۔ گٹھلی کا مغز دست اور ہیضے کے مریضوں کو دیا جاتا ہے۔ پکا ہوا آم بے حد مقوی اور لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے تقویت بخش اجزا کی وجہ سے بھی اس کو پھلوں کا بادشاہ قرار دیا جاتا ہے۔

آم کا پھل تو مفید ہوتا ہی ہے۔ اس کی پتیاں، چھال اور لکڑی بھی کم سودمند نہیں ہیں۔ آم کی پتی کا دھواں ہچکی اور دیگر مختلف قسم کی گلے کی خرابیوں کو دور کرنے میں مدد کرتا ہے۔ آم کے درخت کا گوند اور پھل کے باہر نکلے ہوئے رس میں لیموں کا رس ملا کر جلدی امراض میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی لکڑی کا استعمال دروازے اور فرنیچر بنانے میں کیا جاتا ہے۔ گرمی کے موسم میں آم کے درخت کی گھنی چھاؤں بے حد راحت بخشتی ہے۔ آم کی انھی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اسے پھلوں کا راجا کہا جاتا ہے اور اسی لیے اسے ہندوستان کا قومی پھل قرار دیا گیا۔

□□□

پتہ:
Nizamat Faslati Taleem, MANUU,
Gouchi Bauli, Hyderabad

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

"جتنے پاس اتنے دور" انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی گھیانے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں او رکراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت-/145 روپئے

ذیشان فاطمہ

اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ کا کیریئر

عدیم المثال اقتصادی فروغ کے پیش نظر ان دنوں ہر شعبہ زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور بڑے بڑے معاہدے کر کے دنیا بھر میں مشہور ہو رہا ہے۔ اس طرح اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی کمپنیاں بھی زبردست طریقے سے اپنے قدم جما رہی ہیں۔ ایسے میں جہاں تک انجینئرنگ گریجویٹ طلبہ کی بھرتی کا سوال ہے انجینئرنگ کے شعبے میں اپنا کیریئر بنانے والے طلبہ کے لیے سنہرے دن واپس آ گئے ہیں۔

ان دنوں انجینئرنگ کے طلبہ کے لیے بہت سے متبادل کھلے ہوئے ہیں مثلاً آئی آئی ٹی، جے ای ای اور گرو گوبند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی (جی. جی. ایس. آئی. پی. یو.) اور اس سے منسلک بہت سے ادارے۔ جی. جی. ایس. آئی. پی. یو. اس سلسلے میں اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور یونیورسٹی سے منسلک اداروں میں انجینئرنگ پروگراموں میں داخلے کے لیے انڈر گریجویٹ سطح پر مشترکہ داخلہ امتحان (سی. ای. ٹی.) منعقد کرے گی۔

یہ یونیورسٹی مختلف شعبوں میں تقریباً پچاس پروگرام چلاتی ہے جن میں انجینئرنگ، مینجمنٹ، بایوٹیکنالوجی، ٹریول اینڈ ٹورزم، ایل. ایل. بی. کے پانچ سالہ کورس، ماس کمیونیکیشن، ہوٹل مینجمنٹ، طبی اور نیم طبی پروگرام بھی شامل ہیں۔ یہ کورس یونیورسٹی کے اسکول آف اسٹڈیز کالجوں اور شہر بھر میں پھیلے اس یونیورسٹی سے منسلک اسّی (80) اداروں میں کرائے جاتے ہیں۔ جی. جی. ایس. آئی. پی. یو. میں پچاس فیصد سیٹیں دہلی کے طلبہ کے لیے مخصوص ہیں جبکہ بقیہ سیٹوں پر ملک کے بقیہ حصوں سے آنے والے طلبہ کا داخلہ ہوتا ہے۔ تمام کورس کے لیے داخلے مشترکہ داخلہ امتحان کی بنیاد پر ہی ہوتے ہیں۔ اس وقت 2005 تعلیمی سال کے لیے داخلے جاری ہیں۔ ہر سال پہلا مشترکہ داخلہ امتحان اپریل میں بیچلر آف آرکی ٹیکچر پروگرام کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں جبکہ آخری مشترکہ داخلہ امتحان جون میں فیزیوتھریپی (Physiotherapy) کے ماسٹر کورس کے لیے ہوتا ہے۔

انجینئرنگ کے بعد میڈیسن کے شعبہ کو بھی وہ طلبہ کافی اہمیت دیتے ہیں جو اس شعبے میں انڈر گریجویٹ سطح پر پیشہ ورانہ کورس کرنا چاہتے ہیں کیونکہ کسی کا دکھ دور کرنے سے اچھی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر معاشرے میں ڈاکٹروں کا اس قدر احترام کیا جاتا ہے۔ دہلی یونیورٹی کا میڈیکل سائنس کا شعبہ ایم بی بی ایس کے تقریباً 410 سیٹوں کے لیے اس وقت درخواستیں طلب کر رہا ہے۔

جی. جی. ایس. آئی. پی. یو. سے منسلک وردھمان مہاویر میڈیکل کالج میں داخلے مشترکہ داخلہ امتحان کی بنیاد پر ہوں گے۔ اس کالج میں ایم بی بی ایس کی تقریباً سو (100) سیٹیں ہیں جن کے لیے داخلے کا عمل جاری ہے۔ آپ جواہر لال انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ میڈیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (جیپمر) پانڈی چیری 605006 میں بھی داخلے کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ ان کے کورسوں میں داخلے کے لیے ہر سال مئی میں امتحان ہوں گے۔

وسندھرا (غازی آباد) میں واقع جیپوریا انسٹی ٹیوٹ سی. سی. ایس. یونیورسٹی کے الحاق سے بی. بی. اے. اور بی. ایس. سی. بایوٹیکنالوجی کے کورس کرا رہا ہے جبکہ ایس. وی. بی. پی. یونیورسٹی آف ایگریکلچر اینڈ ٹیکنالوجی کے الحاق سے بی. سی. اے. کے علاوہ اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور الیکٹرانکس اینڈ کمیونیکیشن انجینئرنگ میں بی ٹیک کے کورس کرا رہا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ اسٹڈیز بھی بہت مقبول ہے اور شہر میں واقع پرانے اداروں میں ایک ہے۔ یہ ادارہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان بزنس مینجمنٹ اور پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان ٹورزم مینجمنٹ کا کورس کراتا ہے۔ یہ ادارہ ایم. بی. اے. اور ایم. سی. اے. کے علاوہ بی. بی. اے.، بی. سی. اے.، بی. ایس. سی. مائکرو بایولوجی (آنرس) اور بی. ایس. سی. بایوٹیک (آنرس) جیسے انڈر گریجویٹ سطح کے کورس بھی کراتا ہے۔

اینگرہٹ اکادمی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی اتر پردیش ٹیکنیکل یونیورسٹی کے الحاق سے تین سال کا ایم. سی. اے. کورس کرانے کے علاوہ دو سالہ پی. جی. ڈی. ایم. کورس کراتا ہے۔ دونوں کورس اے. آئی. سی. ٹی. ای. سے منظور شدہ کورس ہیں اور دونوں کورسوں کے لیے 60 سیٹیں دستیاب ہیں۔ دیگر کورسوں میں بی. بی. اے.، بی. سی. اے.، ایل. ایل. بی.، بی ایڈ وغیرہ شامل ہیں جن کے نصاب سی. سی. ایس. یونیورسٹی میرٹھ کے مطابق ہیں۔ اس کے علاوہ ایل. ایل. بی. کورس بھی کرایا جاتا ہے۔ بی. ایس. ایل. انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ، بی. ایل. ایس. آئی. ایم.، جی. جی. ایس. آئی. پی. یو. دہلی کے ساتھ مل کر ایم. بی. اے.، بی. بی. اے. اور بی. سی. اے. پروگرام کراتا ہے۔

اے جے کمار گرگ انجینئرنگ کالج (اے. کے. جی. ای. سی.) کمپیوٹر سائنس اینڈ انجینئرنگ میں بی. ٹیک کورس، آئی. ٹی.، الیکٹرانکس اینڈ کمیونیکیشن انجینئرنگ، میکانیکل انجینئرنگ اور الیکٹریکل اور الیکٹرانکس انجینئرنگ کے کورس کراتا ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی میں ہندوستان کی زبردست ترقی کے بعد سافٹ ویئر انجینئرنگ کی جانب بھی طلبہ کی توجہ بڑھی ہے۔ اس کورس کی طرف طلبہ زیادہ راغب ہو رہے ہیں کیونکہ اس میں مستقبل نہایت روشن نظر آرہا ہے۔ تعلیمی اعتبار سے یہ کورس نہایت شاندار ہے کیونکہ اس سے ذہن کی تجزیاتی اور منطقی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کورس کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے جس سے ہمارے طلبہ ٹائم مینجمنٹ اور دباؤ میں کام کرنے میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے تازہ ترین رجحان اور ترقی سے واقف کرانے کے لیے کئی کالج مختلف سیشن میں سیمینار منعقد کرتے ہیں جہاں طلبہ اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ انڈر گریجویٹ کورس کرنے کے بعد طلبہ میں معلومات کے ساتھ خود اعتمادی آجاتی ہے جس سے وہ ایم. بی. اے. اور ایم. سی. اے. کرنے پر غور کرتے ہیں۔ طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے آئی. آئی. ٹی. اداروں میں درخواست دینے کے بھی اہل ہوتے ہیں۔ کورس اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس سے روزگار حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارے طلبہ کو نوکری کی پیشکش کرنے والی بیشتر کمپنیاں کم از کم ضروری اہلیت کا مطالبہ کرتی ہیں مثلاً گریجویشن میں 60 فیصد نمبر ہو اور دسویں یا بارھویں میں 75-80 فیصد نمبر ہو۔ وپرو، انفوسس، ٹی سی ایس جیسی اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی کمپنیاں مختلف عہدوں مثلاً آئی. ٹی. اینالسٹ، ڈیولپرس، سافٹ ویئر ٹیسٹرس اور کم مشہور بی. پی. او. پوزیشنز کے لیے بھی طلبہ کا انتخاب کرتی ہیں۔ عموماً ان کمپنیوں کے اچھے اداروں سے معاہدے ہوتے ہیں اور یہ خود اپنے یہاں ایم. بی. اے. اور ایم. سی. اے. پروگرام کراتی ہیں۔ (مثلاً وپرو کمپنی کا Wase پروگرام)۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجی سیکٹر میں ابتدائی تنخواہیں ایک لاکھ اسی ہزار سے تین لاکھ روپے (سی. ٹی. سی.) ہوتی ہیں جو غیر اطلاعاتی ٹیکنالوجی سیکٹر کی کمپنیوں مثلاً جے پی کیپیٹل، لیمن برادرس، میک کنسے، ہیوٹ ایسوسی ایٹس، بوسٹن انالیٹکس کے مقابلے میں بہت کم ہے جو تین سے سات لاکھ روپے تک (سی. ٹی. سی.) دیتی ہیں۔ لیکن ایک طے شدہ میعاد کے بعد تنخواہوں میں اضافہ ہوتا ہے اور تنخواہیں پوسٹ گریجویٹ کرنے والوں کی ابتدائی تنخواہوں کے برابر ہو جاتی ہیں۔ (مثلاً ایم سی. اے. ایم. بی. اے. کرنے والوں کی تنخواہوں کے برابر)۔

(ترجمہ: بشکریہ ''ہندوستان ٹائمز'' 15 جون 2008)

پتہ:
Azad Apt.,
Patparganj, New Delhi-99

□□□

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415

قیمت: -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

زبیر احمد بھاگلپوری

C.A.T. کی تیاری کیسے کریں

آج ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے یہاں ہونے والی بحالی میں ان انجینئروں کو بطور خاص ترجیح دیتی ہیں جن کے پاس انجینئرنگ کے ساتھ ساتھ ایم. بی. اے کی ڈگری بھی ہو۔ شاید اسی لیے ایم. بی. اے کے لیے ملک کے تقریباً ہر شہر میں ڈھیر سارے چھوٹے چھوٹے ادارے کُکرمتے کی طرح اگ آئے ہیں جہاں کی اسناد شاید آپ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں معاون ثابت نہ ہوں لیکن ملک کے مستند اداروں خصوصاً .I.I.M سے سند لینے کے بعد آپ کے شاندار کیریئر کا آغاز ہوسکتا ہے لیکن یہاں داخلے سے قبل آپ کو ایک ابتدائی امتحان کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے جس کا نام .C.A.T ہے۔ اس کا فل فارم Common Admission Test ہے۔

آئی آئی ایم کے علاوہ ملک کے دیگر مستند اداروں میں بھی .C.A.T میں حاصل نمبروں کی بنیاد پر ہی داخلہ مل پاتا ہے۔ اس جانچ امتحان میں تعلیمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ منطقی، فطری اور ذہنی صلاحیت کی جانچ سے متعلق سوالات بھی پوچھے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر ریاضیات اور انگریزی مضامین پر مبنی اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ڈسپلن اور خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ اولوالعزمی کا ہونا لازمی ہے کیونکہ .C.A.T میں مسلسل مشق، وسیع تیاری اور محنت شاقہ سے ہی کامیابی مل سکتی ہے۔ اس میں ہر سال الگ الگ انداز کے سوالات پوچھے جاتے ہیں جو عموماً ریاضیات، انگریزی، معلومات عامہ کے علاوہ کوانٹی ٹیٹو ایبلیٹی سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ امتحان دو مرحلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے مرحلے میں تحریری امتحان اور دوسرے مرحلے میں Group Discussion اور Personal Interview کا نظم ہے۔

لازمی لیاقت: .C.A.T میں شامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ یا گریجویشن کے آخری سال میں ہو۔ ویسے .C.A.T کا اس سلسلے میں کوئی متعین معیار نہیں ہے۔ الگ الگ اداروں کے ذریعے اعلان شدہ لازمی لیاقت کی بنیاد پر آپ اپنی خواہش کے مطابق کسی ادارے کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ کچھ اداروں میں گریجویشن کی ڈگری کچھ میں ہائر سیکنڈری یا ایس. ایس. سی میں کم سے کم 50% نمبر شمولیت کا معیار ہیں۔

امتحان: اس امتحان کے پہلے مرحلے میں دو گھنٹے کا تحریری امتحان ہوتا ہے جو ریاضیات، انگریزی، ڈیٹا انٹر پریٹیشن اور لاجیکل ریزننگ سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں کل 150 سوالات کو حل کرنا ہوتا ہے۔ غلط جواب کے لیے 1/4 نمبر کی کٹوتی بھی کی جاسکتی ہے۔

سوالنامے کے سکشن: (الف) پہلا سکشن۔ اس سکشن کے تحت ریاضیات پر مبنی مسائل کے معروضی نوعیت کے 50 سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اس میں ریاضیاتی ڈیٹا اور کوانٹی ٹیٹو ایبلیٹی پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات میں جیومیٹری، منافع اور گھاٹا، ایکویشن، فیصد: تناسب اور ٹریگنومیٹری سے متعلق سوال ہوتے ہیں۔

(ب) دوسرا سکشن: وربل ایبلیٹی (.V.A)، وربل ریزننگ (.V.R) اور ریڈنگ کمپری ہینسن (.R.C)۔ کل 50 سوالات، وی. اے. سے 15 جبکہ وی. آر سے 5 سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ معروضی سوالات میں انگریزی الفاظ کے معنی، استعمال اور خالی جگہ (Blanks) بھرنے سے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ آر. سی. سے کل 30 سوالات پوچھے جاتے ہیں جن کے جوابات 2 سے 3 پیراگراف میں مطلوب ہوتے ہیں۔

(ج) تیسرا سکشن: ڈیٹا انٹر پریٹیشن اور لاجیکل ریزننگ سے کل 50 نمبر کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

تحریری امتحان کے مذکورہ تینوں شکشوں میں کامیابی کے بعد ہی امیدواروں کو گروپ ڈسکشن اور پرسنل انٹرویو کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ .C.A.T پاس کرنے کے لیے نمبروں کی کوئی حد طے نہیں ہوتی اور کٹ آف نمبر بھی ہر سال تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کٹ آف کا معاملہ اکثر متعلقہ ادارے پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ عموماً اچھے نمبر حاصل کرنے کے لیے 80% صحیح جوابات مطلوب ہوتے ہیں جس سے اچھے اداروں کے دروازے داخلے کے لیے کھل جاتے ہیں۔

گروپ ڈسکشن (.G.D): گروپ ڈسکشن میں دراصل ادارے امیدواروں کی شخصیت اور ان کی فطری صلاحیت کی جانچ کرتے ہیں۔ اس میں امیدواروں کی ایک جماعت کو کسی موضوع پر غور وفکر کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر پندرہ سے بیس منٹ تک اظہار خیال کا موقع دیا جاتا ہے۔ بزنس مینجمنٹ کے کسی بھی ادارے میں داخلے کا خاص عمل گروپ ڈسکشن ہی ہے کیونکہ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ امیدوار کے اندر فکری وتکنیکی صلاحیت اور انتظاماتی لیاقت کتنی ہے۔ امیدوار میں کسی جماعت کی سربراہی اور راہنمائی کی صفت اور جماعت کے اراکین کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور

انھیں متاثر کرنے کی صلاحیت کی جانچ اسی گروپ ڈسکشن سے کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مینجمنٹ کے بیشتر ادارے تحریری امتحان کے بعد گروپ ڈسکشن پر خاص توجہ دیتے ہیں۔

پرسنل انٹرویو (P.I.): ذاتی طور پر انٹرویو لے کر بھی امیدوار کی شخصیت کا ہی اندازہ لگانا مقصود ہوتا ہے۔ انٹرویو میں حصہ لینے والے امیدوار کا کردار، ڈسپلن اور مقصد حیات کے ساتھ ساتھ اس میں پائی جانے والی ایک کامیاب منیجر کی صفات کی شناخت انٹرویو پینل کے ذریعے کی جاتی ہے۔

تیاری کا لائحۂ عمل: اس مشکل مسابقتی امتحان کا ہر مرحلہ چونکہ بہت اہم ہے اس لیے تیاری میں بھی عملی منصوبہ درکار ہوتا ہے۔

اس میں کامیابی کے لیے بطور خاص ریاضیات (Mathematics) اور انگریزی کی اچھی صلاحیت لازمی ہے۔ ریاضیات کا گہرا اور وسیع مطالعہ اور سوالات کو جلد سے جلد حل کرنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ عام طور پر امتحان دہندگان کو 50 سوالات کے حل کرنے کے لیے 30 منٹ کا وقت دیا جاتا ہے۔ اس حساب سے ہر سوال کے لیے صرف چالیس سیکنڈ ملتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ سوالات کو حل کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا کر شارٹ کٹ راستہ اپنایا جائے۔ اس زمرے میں تکنیکی ڈگری حاصل کرنے والے امیدواروں کو مہارت حاصل ہوتی ہے لیکن عام گریجویٹ کے لیے بھی ریاضیاتی فارمولے پر خاص گرفت، شارٹ کٹ اور دیگر اصول وضوابط، جن سے سوالات جلد حل ہوسکیں، جاننا بے حد ضروری ہے۔ الجبرا، ٹریگنومیٹری، جیومیٹری اور پیشہ ورانہ ریاضیات کے لیے ثانوی اسکول تک کی کتابوں کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ Quantitative Ability & Problems انھی مضامین کے بنیادی اصولوں پر قائم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سطح کے ریاضیاتی فارمولے پر مسلسل مشق کرنا ضروری ہے۔

C.A.T. کے لیے تکنیکی اور تفصیلی تیاری کے علاوہ سوالات کو جلد حل کرنے کی صلاحیت اور صحیح جواب دینے کی سوجھ بوجھ ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے پیشہ ورانہ ذہنیت درکار ہوتی ہے۔ بہتر تیاری کے لیے کسی مستند ادارے سے کریش کورس یا خط وکتابت پر مبنی کورس کرنا بے حد مفید ہوتا ہے۔ اس سے امیدوار کو سوالات کا نمونہ اور تیاری سے متعلق تکنیکی جانکاری حاصل ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد ذاتی طور پر تیاری کے مرحلے میں ہر امیدوار کو عملی منصوبہ اپنے ذوق سلیم کی بنیاد پر تیار کرنا ہوتا ہے۔ اصل امتحان میں بیٹھنے سے پہلے امیدواروں کو ذاتی سطح پر بھی وقت مقررہ کے اندر سوالات حل کرنے کی مشق کرنی چاہیے۔

چونکہ تمام سوالات کی قدر وقیمت برابر ہوتی ہے اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ طویل اور مشکل سوالات کی بجائے آسان اور مختصر سوالات کا انتخاب کریں تاکہ آپ کو خاطر خواہ وقت مل سکے۔ ویسے بھی امیدوار عموماً زیادہ سے زیادہ سوالات حل کرنے کی ہوڑ میں رہتے ہیں۔ اب باری ہے ''موک ٹسٹ'' کے جوابات کی جانچ کی۔ تو اس سلسلے میں پوری ایمانداری سے سوالات کے حل دیکھیں۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان کی صلاحیت میں اضافے کے لیے مستند کتابیں خرید کر مطالعہ کریں اور اپنی منطقیانہ صلاحیت میں مشق کے ذریعے اضافہ کریں۔

اہم ادارے: بزنس مینجمنٹ کے لیے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ (I.I.M.) کو عالمی پیمانے کے اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس کی چھ شاخیں احمد آباد، بنگلور، کولکاتا، اندور، لکھنؤ اور کالی کٹ میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ملک میں کئی معتبر ادارے ہیں جن میں .C.A.T کی ہی بنیاد پر داخلہ ہوتا ہے۔

❑❑❑

پتہ:
Deptt. of Urdu, Bihar Legislative Council,
Patna-800015

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس/ مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشاپردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکس جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

فیروز عالم

سید مصطفیٰ کمال سے گفتگو

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کا نام ادبی حلقوں کے لیے جانا پہچانا ہے۔ آپ کی شخصیت کے کئی رخ ہیں۔ اردو تحریک سے کوئی 50 برس سے وابستہ ہیں، اردو صحافت سے بھی آپ کا تعلق خاصا پرانا ہے اور درس و تدریس سے بھی طویل عرصے تک منسلک رہے ہیں۔ آپ گذشتہ 40 برس سے اردو کا ایک ایسا رسالہ شائع کر رہے ہیں جو صرف طنز و مزاح کے لیے مخصوص ہے۔ ماہنامہ ''شگوفہ'' نے طنز و مزاح کے حوالے سے جو کام کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ آپ کی ولادت 12 جولائی 1939 کو حیدرآباد میں ہوئی البتہ اسکول سرٹیفکیٹ میں آپ کی تاریخ پیدائش 26 فروری 1939 درج ہے۔ غالباً میٹرک کے امتحان کے لیے درکار عمر کم ہونے کی وجہ سے ساڑھے چار ماہ بڑھا کر عمر لکھوائی گئی۔ آپ کے والد کا نام سید احمد علی اور والدہ کا نام خیرالنسا بیگم تھا۔ والد چونکہ محکمۂ جنگلات میں ملازم تھے اور ان کا اکثر تبادلہ ہوتا رہتا تھا اس لیے بار بار اسکول تبدیل کرنے کی وجہ سے مصطفیٰ کمال صاحب کی ابتدائی تعلیم متاثر ہوئی۔ 1955 میں آپ نے چادر گھاٹ ہائی اسکول، حیدرآباد سے اردو میڈیم میں میٹرک کیا۔ 1958 میں سٹی کالج، حیدرآباد سے انٹرمیڈیٹ اور 1961 میں سائنس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی سے بی. ایس.سی. کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ایک سال سے زائد عرصے تک شعبۂ جنگلات، عادل آباد میں ملازمت کی لیکن یہ ملازمت انھیں پسند نہیں آئی اور واپس حیدرآباد آ گئے۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے 1965 میں جامعہ عثمانیہ سے اردو میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے۔ 1964 میں آپ کی ادارت میں مجلۂ عثمانیہ کا دکنی ادب نمبر شائع ہوا۔ اس خصوصی اشاعت کو دکنیات کے موضوع پر آج بھی حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں کی نگرانی میں ''حیدرآباد میں اردو کی ترقی — تعلیمی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے'' کے زیر عنوان پی ایچ ڈی میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ اس مقالے کے لیے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے کاغذات کی کوئی ڈیڑھ سال تک چھان بین کرتے رہے، کافی مواد بھی اکٹھا کر لیا۔ اسی دوران 1965 میں کالج آف لینگویجز کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا اور دسمبر 1969 تک اس ایوننگ کالج میں رضاکارانہ تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1965 سے 1976 تک روزنامہ ''رہنمائے دکن'' کے صفحۂ شعر و ادب کی ادارت کا کام انجام دیا۔ اسی زمانے میں 1966 سے 1969 کے اختتام تک ممتاز کالج میں پارٹ ٹائم لکچرر رہے۔ انجمن تحفظ اردو کے ترجمان ماہنامہ ''قومی زبان'' کی مجلس ادارت کے بھی رکن تھے۔ یہ مصروفیات پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل میں مانع رہیں۔ لیکن یو جی سی کی ایک اسکیم کے تحت انھوں نے یہ مقالہ 1984 میں مکمل کیا اور 1990 میں یہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے طالب علمی کے زمانے سے ہی اردو تحریک میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ انجمن تحفظ اردو کے بینر تلے آپ آندھرا پردیش میں اردو کو اس کا جائز مقام دلوانے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی مجلس عمل کے بھی وہ رکن تھے۔ نومبر 1968 میں رسالہ ''شگوفہ'' جاری کیا جو تا حال پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ جنوری 1970 میں انوارالعلوم ایوننگ کالج میں آپ کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوا۔ 1976 میں انوارالعلوم ڈے کالج میں منتقل ہو گئے۔ 1984 میں ریڈر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے اور 1997 میں وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔ جب 1998 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور فاصلاتی طرز تعلیم کے تحت بی اے کے آغاز کا فیصلہ ہوا تو درسی مواد کی تیاری و اشاعت کے لیے آپ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یونیورسٹی میں ٹرانسلیشن ڈویژن قائم کیا گیا اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کو کوآرڈینیٹر اور انچارج مقرر کیا گیا۔ وہاں انھوں نے قریب آٹھ سال خدمات انجام دیں اور اپنی نگرانی میں 198 کتابیں شائع کرائیں جن میں اردو میں پہلی بار ترجمہ کی گئی بی کام کی 54 کتابیں شامل ہیں۔ آپ نے آندھرا پردیش کے مدارس کی نصابی کتابوں کے اشاعتی پروجیکٹس میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال سے حال ہی میں کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہیں۔

سوال: ''شگوفہ'' کی اشاعت کا خیال کیسے آیا؟

جواب: 1965 میں برصغیر کے ممتاز طنز و مزاح نگار اور میرے دوست مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح نگاروں کی ایک قومی کانفرنس کے انعقاد کا ارادہ کیا۔ طے ہوا کہ حلقۂ ارباب ذوق اور فائن آرٹس اکادمی کے ادبی شعبے زندہ دلان حیدرآباد کے اشتراک سے یہ کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس کے لیے ایک مجلس استقبالیہ تشکیل دی گئی جس کے صدر بھارت چند

لکھنؤ، نائب صدور میر عابد علی خاں، پدم دیر، اور منظور حسن، معتمد عموی مجتبیٰ حسین، نائب معتمدین حمایت اللہ اور حفیظ قیصر منتخب ہوئے۔ مجھے آفس سکریٹری چنا گیا۔ مئی 1966 میں کانفرنس ہوئی جس کی صدارت کرشن چندر نے کی۔ ملک کے تمام اہم طنز و مزاح نگار پہلی بار ایک اسٹیج پر جمع ہوئے۔ یہ کانفرنس بے حد کامیاب رہی۔ کانفرنس کے موقعے پر اس کا سووینئر شائع ہوا جس کے مرتبین میں میں بھی شامل تھا۔ اس سووینئر کو توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1967 میں دوسرے کل ہند مزاحیہ مشاعرے اور 1968 میں تیسرے سالانہ اجتماع پر سووینئر شائع ہوئے اور ان کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ اس سے مجھے تحریک ملی اور میں نے خالص طنز و مزاح کا رسالہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سووینئر کی مقبولیت اس بات کی شہادت تھی کہ قارئین طنزیہ و مزاحیہ تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ 1968 میں پرچہ نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ میں نے مجتبیٰ حسین سے مشورہ کیا تو انھیں بھی یہ خیال پسند آیا۔ پرچے کا نام ''خنداں'' سوچا گیا تھا، دوسری ترجیح ''شگوفہ'' تھی۔ رجسٹرار نیوز پیپر آف انڈیا سے ''شگوفہ'' کی منظوری ملی۔ زندہ دلان حیدرآباد سے معاہدہ ہوا کہ یہ پرچہ اس کا ترجمان ہوگا تاہم اس کے مالکانہ حقوق میرے نام ہوں گے۔

یکم نومبر 1968 کو ''شگوفہ'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا جس کی مجلس مشاورت میں کرشن چندر، بھارت چند کھنہ اور زینت ساجدہ تھے اور مجلس ادارت میں احسن علی مرزا، مجتبیٰ حسین اور حمایت اللہ۔ جون 1973 تک یہ رسالہ ڈیڑھ ماہی تھا اس کے بعد ماہنامہ ہوگیا۔ اس کی ابتدائی ساڑھے چار سالہ سفر میں کل 36 شمارے نکلے اور کبھی وقفہ نہیں آیا البتہ بعد کے دور میں چند سالنامے مشترکہ شمارے کی صورت میں شائع ہوئے۔

سوال: زندہ دلان حیدرآباد کا ابھی آپ نے ذکر کیا۔ یہ کس قسم کی تنظیم ہے؟

جواب: جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا زندہ دلان حیدرآباد، فائن آرٹس اکادمی حیدرآباد کا ادبی شعبہ تھا۔ 1950 میں فائن آرٹس اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور کسی نام کے بغیر اس کا ادبی شعبہ بھی قائم ہوگیا۔ 1961 میں زندہ دلان حیدرآباد کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ایک مزاحیہ مشاعرہ نشر ہوا جس کے بعد عزیز قیسی کی صدارت میں منعقدہ فائن آرٹس اکادمی کی ایک میٹنگ میں اس ادبی شعبے کا نام زندہ دلان حیدرآباد رکھا گیا۔ زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے فائن آرٹس اکادمی حیدرآباد کے بینر تلے 1962 سے ہر سال ریاستی سطح پر مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ 1966 کی کل ہند کانفرنس کے بعد زندہ دلان حیدرآباد کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ میری تجویز پر اس تنظیم کا باقاعدہ دستور بنایا گیا اور 1968 میں اسے خود مختار حیثیت حاصل ہوگئی۔ بھارت چند کھنہ کو صدر اور مجتبیٰ حسین کو معتمد عموی بنایا گیا۔ تب سے اب تک یہ تنظیم ملک میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے سنجیدگی سے عمل پیرا ہے۔ 1972 میں مجتبیٰ حسین کی دہلی میں منتقلی کے بعد حمایت اللہ، مصطفےٰ علی بیگ اور پھر طالب خوندمیری اس کے معتمد عموی منتخب ہوئے۔ بھارت چند کھنہ کے بعد نریندر لوتھر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صدارت پر فائز ہوئے۔ نریندر لوتھر کی تحریک پر ان کی صدارت میں عالمی طنز و مزاح کانفرنس 1984 میں منعقد ہوئی جس میں مختلف ممالک کے وفود نے حصہ لیا اور ہندوستان کی مسلمہ زبانوں کے متوازی اجلاس بھی منعقد ہوئے۔

سوال: کیا آپ کو شروع میں یہ امید تھی کہ اس قدر طویل عرصے تک اتنی پابندی سے ''شگوفہ'' شائع کرسکیں گے؟

جواب: ابتدا میں مجھے امید نہیں تھی کہ یہ رسالہ اتنے طویل عرصے تک جاری رہ پائے گا لیکن قارئین کی حوصلہ افزائی اور میرے مزاج کی ثابت قدمی اور احباب کے خلوص کی وجہ سے یہ پرچہ اس سال نومبر میں 40 برس پورے کرنے میں کامیاب ہوگا۔ ابتدائی دنوں میں میرے ذہن میں رسالے کا کوئی بہت واضح خاکہ نہیں تھا لیکن آہستہ آہستہ طنز و مزاح کا ایک خاص مزاج اس نے اپنایا جس میں ابتذال، تمسخر اور بھونڈا پن کی گنجائش نہیں تھی۔ گروہ بند ادبی رقابتوں اور شخصی حملوں سے ہمیشہ احتراز کیا گیا۔ اس رسالے نے طنز و مزاح کا ایک اعلیٰ معیار قائم کرنے کی کوشش کی اور ملک اور بیرون ملک میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ خلیجی ممالک خصوصاً سعودی عرب کے اردو قارئین نے رسالے کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ ہماری اوورسیز کمیٹی اور اس کے کنوینر عابد معز نے اردو دنیا میں ''شگوفہ'' کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔

سوال: ''شگوفہ'' میں تنقیدی مضامین کیوں شائع نہیں کیے جاتے جب کہ کسی بھی صنف کی سمت و رفتار کا پتہ لگانے کے لیے یہ اہم ذریعہ ہیں؟

جواب: یہ صحیح ہے کہ ''شگوفہ'' کے عام شماروں میں ہم تنقیدی مضامین کم شائع کرتے ہیں لیکن خاص شماروں میں موضوع کی مناسبت سے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی تحریریں شامل اشاعت رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستانی مزاح نمبر (نثر) میں 14 اہم ہندوستانی زبانوں کے مزاح کے نمونوں کے ساتھ ہر زبان میں طنز و مزاح کی روایت پر ایک مختصر مضمون شائع کیا گیا تھا۔ ''پیروڈی نمبر'' میں پیروڈی کے فن پر اردو میں پہلی بار کافی مواد یکجا کیا گیا۔ 37 سالہ نمبر میں مزاحیہ رسالوں کا

جائزہ لیا گیا اور خاص طور سے ''اودھ پنچ'' پر سیر حاصل مواد مہیا کیا گیا۔ مختلف اہم طنز و مزاح نگاروں پر شائع کیے گئے خصوصی نمبروں میں ان شخصیتوں کے فن پر لازمی طور سے تنقیدی مضامین شامل رہتے ہیں۔ ''شگوفہ'' میں اکثر طنز و مزاح نگاروں کے گوشے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جس میں ایک تنقیدی مضمون شریک رہتا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج ادبی رسالوں کے قاری زیادہ تر ادیب و شاعر ہی ہیں جو صرف اپنی دلچسپی کے خاص موضوعات پر تنقیدی مضمون پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف ''شگوفہ'' کے 95 فیصد قاری '' خالص قاری'' ہیں جو چاہتے ہیں کہ طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات سے لطف اندوز ہوں۔ انھیں طنز و مزاح کی سمت و رفتار کا خوب اندازہ ہے۔ ہمارے اکثر نقادوں کا حال یہ ہے کہ انھیں نہ تو عصری طنز و مزاح نگاروں کے فن اور ان کے رجحانات کا اندازہ ہے اور نہ موضوعات کا۔ جس مزاحیہ کتاب کا مقدمہ لکھیں گے اس کے مصنف کی مدح سرائی میں غلو سے کام لیں گے اور دیگر تمام مزاح نگاروں کو دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیب و شاعر قرار دیتے ہوئے انھیں ادب کے دائرے سے ہی خارج کرنے کا فتویٰ جاری فرما دیتے ہیں!

سوال: ''شگوفہ'' کے اب تک کون کون سے خاص نمبر شائع ہوئے ہیں؟

جواب: ہندوستانی مزاح نمبر، پیروڈی نمبر، ڈراما نمبر، خلیج نمبر، رشید احمد صدیقی نمبر، کنھیا لال کپور نمبر، مجتبیٰ حسین نمبر، مشتاق احمد یوسفی نمبر، تخلص بھوپالی نمبر، بھارت چند کھنہ نمبر، نریندر لوتھر نمبر، یوسف ناظم نمبر، سلیمان خطیب نمبر، خواجہ عبدالغفور نمبر، ابراہیم جلیس نمبر۔ ان کے علاوہ سالنامے اور راجندر سنگھ بیدی، شوکت تھانوی، دلیپ سنگھ اور کرنل محمد خاں پر گوشے شائع ہوئے۔

سوال: ''شگوفہ'' کے لیے طنزیہ و مزاحیہ تحریریں، خاص طور سے تازہ تخلیقات حاصل کرنے میں آپ کو کبھی کوئی مشکل پیش آئی؟

جواب: ''شگوفہ'' کی اشاعت کے بعد کچھ ایسا ماحول بنا کہ جو لوگ پہلے سے طنز و مزاح لکھ رہے تھے، ان کی تخلیقی رفتار میں کافی تیزی آئی۔ ہماری کوشش تھی کہ نامور ادیبوں اور شاعروں خصوصاً فکشن نگاروں سے طنزیہ و مزاحیہ چیزیں لکھوائیں۔ اس میں ہمیں کامیابی بھی ملی۔ کرشن چندر نے ہماری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے زندہ دلانِ حیدرآباد کو اپنا ڈراما ''دروازے کھول دو'' اسٹیج کرنے کے لیے تحریری طور پر اجازت دی۔ ان کی تحریریں ''شگوفہ'' میں چھپتی رہیں۔ ''حجام کی واپسی'' قسط وار شائع ہوا۔ جیلانی بانو، نعیم زبیری، عوض سعید، رفیعہ منظور الامین کے علاوہ اساتذۂ کرام گیان چند جین، ڈاکٹر حبیب ضیا اور ڈاکٹر لئیق صلاح وغیرہ نے کم کم ہی سہی اپنے رشحاتِ قلم سے ''شگوفہ'' کے مشمولات کو وقیع تر بنانے میں اہم حصہ لیا۔ ان کہنہ مشق تخلیق کاروں کے علاوہ بے شمار نئے لکھنے والوں نے مستقل مزاجی اور استقلال کے ساتھ عصری تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے ''شگوفہ'' کے ادبی سرمائے میں باوقار اضافہ کیا۔

سوال: ''شگوفہ'' کو کن بڑے طنز و مزاح نگاروں کی سرپرستی حاصل رہی؟

جواب: یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ابتدا سے ہی تمام عصری طنز و مزاح نگاروں نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ کرشن چندر تو روزِ اول سے مجلسِ مشاورت میں شامل تھے۔ ان کا قلمی اور عملی تعاون ''شگوفہ'' کو حاصل تھا۔ ان کے علاوہ کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، رضا نقوی واہی، دلاور فگار، مجتبیٰ حسین اور کنور مہندر سنگھ بیدی کا قلمی تعاون رسالے کو ہمیشہ حاصل رہا۔

سوال: ''شگوفہ'' کی اشاعت کا آغاز ایک ایسے دور میں ہوا جب ترقی پسندی اور جدیدیت کی کش مکش ابھی جاری تھی۔ آپ نے پرچے کو ان دونوں کے اثر سے کس طرح دور رکھا۔

جواب: طنز و مزاح کا سماج سے رشتہ بہت گہرا ہے۔ سماجی شعور کے بغیر طنز و مزاح نگار کا قلم اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا۔ طنز و مزاح کو اصلاحی مقاصد کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، اس وجہ سے ترقی پسند تحریک اور طنز و مزاح نگار میں قربت تو پیدا ہوسکتی ہے لیکن طنز و مزاح نگار کو نظریاتی طور پر کسی ایجنڈے کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ دوسری طرف جدیدیت ادب میں مقصدیت کی قائل نہیں تھی تاہم جدیدیت پسند نقادوں نے طنز و مزاح کے فنکارانہ اظہار کو ہمیشہ تحسین کی نگاہ سے دیکھا یہ اور بات ہے کہ جدیدیت پسندوں نے اب کلاسکیت کے ساتھ سماج سے بھی رشتہ قائم کرلیا ہے۔

طنز و مزاح کے تمام موضوعات چونکہ سماجی اور معاشرتی موضوعات ہیں اس لیے اس پیرایۂ اظہار کو ان لوگوں نے اپنایا جو برائیوں پر نگاہ رکھتے تھے اور ناہمواریوں پر چوٹ کرنا چاہتے تھے۔ چوٹ یا طنز نظریاتی ادبی اختلافات سے ماورا ایک اعلیٰ ادبی قدر اور آفاقی طرزِ اظہار ہے۔ چنانچہ طنز و مزاح کا کام حق بات کو عوام تک پہنچانا ہے۔ ''شگوفہ'' نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔ آج جب کہ ادبی تحریکیں کمزور پڑ گئی ہیں، گروہ بندانہ رقابت کا بیج بویا جارہا ہے، ''شگوفہ'' طنز و مزاح کے فروغ کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس پر کسی تحریک کے عروج و زوال کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یوں بھی ایسا کون ہے جو ہنستے ہنساتے اپنا کام کرنے کا قائل نہ ہو؟

سوال: ایک زمانے تک طنز ومزاح کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اس کی کیا وجوہات تھیں؟

جواب: اس کے ذمے دار کچھ حد تک طنز ومزاح نگار بھی تھے۔ ماضی میں احساسِ برتری، تمسخر اور دوسروں پر ہنسنے کا رجحان غالب تھا۔ ماضی میں مزاح نگار درباروں سے منسلک تھے۔ لطائف کے ذریعے مخالفین پر حملے کیے جاتے تھے، دوسروں کی تذلیل وتوہین کی جاتی تھی۔ شعرا کے ادبی معرکوں کی بھی یہی سطح تھی۔ غالب پہلا شاعر ہے جو اپنا مذاق اڑانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ غالب کے بعد صحت مند فضا بنی اور طنز ومزاح کے اعلیٰ معیار کا تعین ہوا۔ 1985 میں ''شگوفہ'' کے ہندوستانی مزاح نمبر کے لیے نقادوں سے پوچھا گیا تھا کہ وہ طنز ومزاح کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اکثر نقادوں نے اسے دوسرے درجے کا ادب قرار دیا تھا لیکن آج کا نقاد یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ کسی صنف کا کوئی درجہ نہیں ہوتا، تخلیق اور تخلیق کار کے درجے کا تعین ہوسکتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کو ادب کے کس درجے میں رکھیں گے؟

سوال: اردو میں طنز ومزاح کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہندوپاک میں گذشتہ تیس چالیس سال سے جو طنز ومزاح لکھا جارہا ہے وہ موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے، زبان کی چاشنی، اسلوب کی تازگی اور عصری آگہی اور سماجی شعور کے اعتبار سے یقیناً اس لائق ہے کہ آپ اسے ادب کا قابل قدر حصہ سمجھیں۔ یہ بات مانی جاتی ہے کہ اردو میں طنز ومزاح کا جو سرمایہ ہے، ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور باوقار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے درجۂ اوّل کے جو طنز ومزاح نگار تھے، جنھوں نے طنز ومزاح کا معیار بلند کیا، وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں جیسے شفیق الرحمن، ابن انشا، رشید احمد صدیقی، کرنل محمد خاں، ضمیر جعفری، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، رضا نقوی واہی، دلاور فگار اور احمد جمال پاشا وغیرہ۔ لیکن نئی نسل میں کئی نام نمایاں ہوئے ہیں۔ نثر اور نظم کی تقریباً تمام اصناف میں طنز ومزاح کے بہترین نمونے سامنے آرہے ہیں۔ بعض اوقات مکمل طور پر اور کبھی جزوی طور پر طنز ومزاح کا اسلوب مختلف النوع تحریروں پر حاوی نظر آتا ہے، خاص طور سے نثر میں۔ مزاحیہ ناول اور افسانے گو کہ کم لکھے جارہے ہیں لیکن سفرنامے، رپورتاژ، انشائیے، تقریظ، تاثراتی مضامین، سوانح اور خودنوشت سوانح وغیرہ طنزیہ ومزاحیہ پیرائے میں مسلسل لکھے جارہے ہیں۔

سوال: اردو تحریک میں آپ طالب علمی کے زمانے سے سرگرم ہیں۔ آندھرا پردیش میں اردو کو اس کے جائز حقوق دلوانے کی سمت میں کی گئی کوششوں کے بارے میں کچھ بتائیے۔

جواب: آزادی کے بعد 1948 میں حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا۔ اردو ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان تھی۔ یکلخت تمام دفاتر اور مدارس سے اردو ہٹادی گئی۔ اس بدلے ہوئے خوف اور جبر کے ماحول میں اردو تعلیم کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش اور خاص طور پر اس کے معتمد مولوی حبیب الرحمن نے اردو کو اس کا کھویا ہوا مقام دلوانے کی کوشش شروع کی۔ 1956 میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل نو ہوئی اور وسیع تر ریاست آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد مخالف اردو لہر میں کمی آئی۔ آندھرا کے سیاسی قائدین نے اردو کے تئیں فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا۔ وزیر اعلیٰ نیلم سنجیوا ریڈی نے جامعہ عثمانیہ کے بین کلیاتی اردو فیسٹول میں (جو پروفیسر عبدالقادر سروری کی سرپرستی میں ہر سال منعقد ہوتا تھا) اعلان کیا کہ ماضی میں اردو کا جو خصوصی موقف رہا ہے اس کے پیش نظر اسے ریاست آندھرا پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا مقام حاصل رہے گا۔ اس اعلان سے اردو والوں میں پھیلی ہوئی مایوسی دور ہوئی اور انجمن ترقی اردو کو پرامن ماحول میں کام کرنے کا موقع ملا۔

اسی زمانے میں میرے دوست چندر سریواستو نے انجمن تحفظ اردو کی ضلع میدک میں بنیاد ڈالی۔ بعد میں وہ حیدرآباد منتقل ہوگئے۔ میں بھی نائب معتمد کی حیثیت سے انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔ ساری ریاست میں اس انجمن کی شاخیں قائم کی گئیں۔ باگا ریڈی (سابق وزیر آندھرا پردیش) عرصۂ دراز تک اس انجمن کے صدر رہے۔ انجمن نے ایک ماہنامہ بھی شائع کرنا شروع کیا جس کا نام ''قومی زبان'' تھا۔ اس کے مدیر چندر سریواستو تھے۔ یہ رسالہ اس زمانے میں اردو تحریک کی اہم آواز سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں اس رسالے کے حقوق اردو اکادمی آندھرا پردیش کے نام منتقل کردیے گئے۔

انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش نے ریاست کے مدارس میں اردو تعلیم کی صورت حال کو بہتر بنانے کے سلسلے میں بعض بنیادی کام کیے۔ ریاستی اسمبلی کے منظورہ لسانی بل 1965 میں اردو کی شمولیت کے لیے وسیع پیمانے پر مہم چلائی گئی لیکن اس وقت کے وزیر تعلیم نرسمہا راؤ کے معاندانہ رویے کے نتیجے میں آندھرا پردیش میں اردو دوسری سرکاری زبان نہیں بن سکی۔ البتہ بل کی دفعہ 7 (سات) کے تحت اردو کے لیے چند سہولتیں مہیا کی گئیں۔ بل کی منظوری کے بعد مسلسل جدوجہد کے طفیل جو سرکاری حکم نامے جاری ہوئے ان سے انتظامیہ

اور تعلیم کی سطح پر اردو کے استعمال کی صورتحال کسی قدر بہتر ہوئی۔ حالیہ عرصے میں آندھرا پردیش کے کئی اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا موقف دیا گیا لیکن ان احکامات پر عمل آوری کی سطح پر اردو والوں کو کسی طرح کا تعاون حاصل نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ خود اردو والے بھی آج اردو تحریک سے ماضی کی طرح خلوص اور جذبے کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔

سوال: ادب میں طنز و مزاح کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا آغاز آپ کب سے مانتے ہیں؟

جواب: طنز و مزاح انسانی اظہار کا سب سے دلکش اور موثر اسلوب ہے۔ ادیب وشاعر اپنے شگفتہ طرز اظہار سے قاری کے لیے نشاط اور انبساط کی ایک خاص فضا تعمیر کرتے ہیں۔ غیر متناسب، بے جوڑ، مضحک مظاہر کی ظریفانہ تصویر کشی سے مزاح پیدا ہوتا ہے اور کبھی فرد یا سماج کی کمزوریوں کو اصلاح کی خاطر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس طنز میں نشتریت اور چبھن ہوتی ہے۔ قاری طنز و مزاح کی دونوں کیفیتوں میں زندگی کی بوالعجبیاں دیکھتا ہے۔

خالص طنز و مزاح کے دبستان کا آغاز دلی اور لکھنؤ کے خوش فکر و خوش نوا تخلیق کاروں کی تحریروں سے ہوا۔ لندن کے ''پنچ'' اخبار کے اتباع میں شائع ہونے والا ''اودھ پنچ'' اخبار طنز و مزاح کی اولین تحریک بن گیا۔ اس اخبار سے وابستہ طنز و مزاح نگاروں نے سیاسی اور سماجی مسائل کے ذریعے عوام سے اپنا رشتہ قائم کیا۔ انیسویں صدی کی اس روایت کو بیسویں صدی کے تخلیق کاروں نے تازہ موضوعات اور نئے اسالیب کے ساتھ نئی ہیئتوں میں پیش کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ اب وہ ہر بات، بلالحاظ نثر و نظم مزاح کے اسلوب میں کہنے پر قادر ہوئے۔

سوال: کیا وجہ ہے کہ نثر میں اچھے طنز و مزاح نگاروں کی ایک بڑی فہرست نظر آتی ہے لیکن شاعری کے میدان میں اکبر الہٰ آبادی کے بعد کوئی بڑا نام ابھر کر سامنے نہ آسکا؟

جواب: مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ طنز و مزاح میں نثر کا معیار نظم کے مقابلے میں نہایت بلند ہے۔ نثر لکھنے والے طنز و مزاح نگاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے نہ صرف شخصی طور پر ادب میں اونچا مقام حاصل کیا بلکہ ان کی تحریروں سے اردو ادب کے وقار اور اس کے ادبی سرمایے میں بھی اضافہ ہوا۔ مشتاق احمد یوسفی آج اردو نثر کی آبرو ہیں۔ (سچ کہا گیا کہ یہ ''دور یوسفی'' ہے)۔ اکبر الہٰ آبادی کے بعد مزاحیہ شاعری کے میدان میں صرف رضا نقوی واہی اور دلاور فگار نے تخلیقی سطح پر خود کو منوایا۔ لیکن اکبر کی سی فنکارانہ چابک دستی کسی مزاحیہ شاعر کو نصیب نہ ہوسکی۔ شاعری بھی عام طور پر سامع کی پسند کا تابع ہوتا ہے۔ ایک تو ذہین شعرا مزاح کی طرف کم مائل ہوئے اور جو مائل ہوئے تو ان کے وژن اور اظہار کی سطح میں کبھی تال میل نہ ہوسکا۔ اس طرح مزاح میں اکبر الہٰ آبادی کا ثانی پیدا نہ ہوسکا۔

□□□

پتہ:
Nizamat Faslati Teleem,
MANUU, Gouchi Bawli,
Hyderabad-500032

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کر رہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہندو پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کردی ہے۔

صفحات: 336، قیمت: -/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد حبیب/خلیق احمد نظامی (ہماری مطبوعات سے)

سلطان ابراہیم لودی (26-1517)

سلطان سکندر لودی کی وفات کے بعد 8 ذیقعدہ 923ھ مطابق 22 نومبر 1517 میں اس کے سب سے بڑے لڑکے ابراہیم کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن امرا نے ایک ہی شخص کے ہاتھوں میں طاقت کے ارتکاز کو پسند نہ کیا جیسا کہ سکندر کے دور حکومت میں ہو چکا تھا لہٰذا انھوں نے سلطنت کو دو اکائیوں میں تقسیم کردینے کا انتظام کیا۔ ایک تو ابراہیم کی ماتحتی میں دوسرے اس کے چھوٹے بھائی جلال خاں کی ماتحتی میں۔ جون پور کی گزشتہ سلطنت کی سرحدوں تک کا حصہ ابراہیم کے حصے میں آیا جب کہ جلال خاں کو اس خطۂ ارض پر حکومت کرنا تھی جو شرقیوں کی حکمرانی میں تھا۔ ایک معاہدہ ہوگیا اور اسی کے مطابق سلطنت کو تقسیم کردیا گیا۔

لہٰذا جلال خاں اپنے ترکے کے حصے کی ذمے داری سنبھالنے کے لیے جون پور روانہ ہوا لیکن وہ چند دنوں کے لیے کالپی میں ٹھہر گیا اور تفریح و شکار میں اپنا وقت ضائع کردیا۔ اس نے اعظم ہمایوں خاں سروانی کے بیٹے فتح خاں کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

سلطنت کی تقسیم دونوں بھائیوں نے باضابطہ طریقے پر کی تھی اور اگر اس کے احترام کا عزم موجود ہوتا تو یہ منصوبہ اچھی طرح چل سکتا تھا۔ مگر راپری کے جاگیردار خاں جہاں لودی کی دربار میں آمد نے اس انتظام میں خلل ڈال دیا۔ اس نے سلطان ابراہیم اور امرا سے کہا کہ سلطنت کی تقسیم ناعاقبت اندیشانہ ہے اور جتنا جلد اس کو منسوخ کیا جائے اتنا ہی یہ افغانوں کے مفاد میں بہتر ہوگا۔ خان جہاں لودی کا مشورہ سیاسی طور پر دانشمندانہ ہونے کے باوجود اپنی روح میں عیارانہ (Machiavellian) تھا اور یہ وعدہ شکنی کا نمونہ تھا۔ ابراہیم نے فوراً ہی خان جہاں لودی کا مشورہ قبول کرلیا کیونکہ وہ اس کی اپنی خواہشات کے مطابق تھا۔

پہلے تو معاہدے کی منسوخی کا فیصلہ کیا گیا پھر اس کی منسوخی کے لیے ذرائع وطرائق کی تحقیق وتفتیش کی گئی۔ تجویز پیش کی گئی کہ اس سے پہلے کہ جلال خاں اپنے آپ کو جون پور میں مستحکم کرے، قدم اٹھانا ضروری ہے۔ اس لیے ایک فرمان جلال کے پاس نہایت شستہ اور دلکش زبان میں اس سے یہ درخواست کرتے ہوئے بھیجا گیا کہ وہ فوراً دربار واپس آئے کیونکہ ایک اہم معاملے پر اس کے مشورے کی فوری ضرورت ہے۔ ہیبت خاں گرگ انداز جو ظاہری خوش نمائی اور ترغیب وتحریص کی صلاحیتوں کا حامل ایک نہایت دانشمند شخص تھا، اسے شیشے میں اتارنے کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہیبت خاں اپنی منزل پر پہنچ سکے، جلال کے پاس سازش کی اطلاع پہنچ گئی۔ ٹھیک وقت پر خطرے سے آگاہ ہوکر اس نے امرا کے سازشی داؤ کا شکار ہونے سے انکار کردیا۔ تب ابراہیم نے شیخ زادہ سلطان محمد (شیخ سعید فرملی کا بیٹا) ملک اسماعیل (ملک علاؤ الدین جلوانی کا بیٹا) اور قاضی حمید الدین حاجب جیسے امرا پر مشتمل ایک وفد اسی مشن پر روانہ کیا جس میں ہیبت خاں کو ناکامی ہوگئی تھی۔ یہ وفد بھی جلال خاں کو آگرہ آنے کی ترغیب نہ دے سکا۔ لہٰذا ابراہیم نے جلال خاں کے خلاف اقدام کرنے اور اس سے پہلے کہ وہ جون پور میں اپنی پوزیشن مستحکم کرلے اسے مفلوج کردینے کا فیصلہ کیا۔

جلال کے امرا کو اس سے برگشتہ کرنے اور ان کو اپنی حمایت میں کرلینے کے لیے ابراہیم نے انھیں بڑے تحائف اور مستقبل میں انعامات کے دعوں کے ساتھ متعدد فرمان بھیجے۔ ہر فرمان ایک معتمد افسر کے ذریعے بھیجا گیا۔ جلال خاں کے چند ممتاز امرا نے جن کی ماتحتی میں تیس سے لے کر چالیس ہزار سپاہی تھے (مثلاً بہار کی ولایت کا حاکم دریا خاں نوحانی، غازی پور کا جاگیردار نصیر خاں اور اودھ اور لکھنؤ کا ضابط شیخ زادہ) اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابراہیم سے جا ملے۔

اس لیے 15 ذی الحجہ 923ھ مطابق 29 دسمبر 1517 کو ابراہیم نے دوسری بار تاج پوشی کی رسم منائی۔ اسی موقعے پر امرا اور افسروں کو جاگیریں، خلعتیں، عہدے اور ذمے داریاں عطا کی گئیں۔ دوسری رسم تاجپوشی دراصل سابقہ معاہدے کی منسوخی کا اور ان علاقوں پر جو ابتدا میں جلال کے سپرد کیے گئے تھے ابراہیم کے خودمختارانہ حق کے دعوے کا ایک عام اعلان تھا۔

جلال کے ساتھ کشمکش

اس صورت حال کو قبول کرنے کی توقع جلال سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ

"جامع تاریخ ہند" سے ماخوذ، مرتبین: محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی/صفحات 1000، قیمت: -/306روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

اس معاہدے سے ایک شرمناک انحراف تھا جو اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان عمل میں آیا تھا۔ اس نے اپنی عسکری طاقت بڑھا کر او رمقامی زمینداروں سے مل کر کالپی میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنی شروع کردی۔ اس نے سلطان جلال الدین کا خطاب اختیار کیا اور اپنے نام کو خطبے میں پڑھوایا اور سکوں پر منقش کرایا۔ جیسے ہی اس نے اپنی پوزیشن مستحکم کرلی وہ گوالیار کی جانب روانہ ہوا۔ جہاں اعظم ہمایوں سروانی نے قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اسے یہ پیغام بھیجا کہ ”میں آپ کی (اعظم ہمایوں) عزت اپنے باپ اور چچا کی حیثیت سے کرتا ہوں آپ کا فرض ہے کہ آپ حق و انصاف کا ساتھ دیں اور اسی کی حمایت کریں۔“[1] اعظم ہمایوں اس پیغام سے متاثر ہوا اور اس نے جلال سے جاملنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کے درمیان فیصلہ ہوا کہ پہلے وہ جون پور کی ولایت کو مغلوب کریں گے۔ لہٰذا انھوں نے اودھ کے گورنر سعید خاں پر حملہ کردیا، جو لکھنؤ بھاگ گیا اور ابراہیم کو حملے کے بارے میں لکھا۔

اب ابراہیم کو حرکت کرنی پڑی۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال کی ایک مدافعت کے طور پر اس نے اپنے قیدی بھائیوں اسمٰعیل خاں، حسین خاں اور شیخ دولت خاں کو ہانسی کے قلعے میں بھیج دیا۔ لیکن ان کے لیے تمام آسانیاں فراہم کردیں۔ 24 ذی الحجہ 923ھ مطابق 6 جنوری 1518 کو وہ حد سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھون گاؤں پہنچا اور قنوج پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ راستے میں اسے یہ اطلاع ملی کہ اعظم ہمایوں سروائی اور اس کے بیٹے فتح خاں نے جلال خاں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور وہ اس سے ملنے آرہے ہیں۔ ابراہیم نے ان کے استقبال کے لیے اپنے ممتاز امرا کو بھیجا اور ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص خلعت اور ہیروں سے جڑا ہوا ایک چھتر عنایت کیا۔

پرگنہ کوئل میں شامل جرتولی کے زمینداروں نے، جو اپنی سرکشانہ سرگرمیوں میں بدنام تھے، اسی اثنا میں بغاوت کردی اور ایک جھگڑے میں انھوں نے عمر خاں (سکندر خاں سور کے بیٹے) کو مار ڈالا۔ سنبھل کا گورنر ملک قاسم ان کے خلاف کارروائی کے لیے روانہ ہوا اور اس نے اور ان کے سرغنے کو مار ڈالا۔ بغاوت فرو ہوگئی۔

جون پور کے متعدد امرا نے مثلاً سعید خاں اور شیخ زادہ فرملی نے جلال کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابراہیم لودی سے جاملے۔ اس سے ابراہیم کی پوزیشن کافی مضبوط ہوگئی۔ اعظم ہمایوں سروانی، اعظم ہمایوں لودی اور نصیر خاں نوحانی جیسے ممتاز افغانی امرا کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج جلال سے نمٹنے کے لیے بھیجی گئی، جو اس وقت کالپی میں خیمہ زن تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ فوج کالپی پہنچے جلا جلال تیس ہزار گھوڑ سواروں اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل فوج کے ساتھ آگرہ پر حملے کے لیے روانہ ہوگیا۔ نعمت خاتون، قطب خاں لودی، عماد الملک، ملک بدرالدین جلوانی اور وہ لوگ جو جلالی حرم سے متعلق تھے، کالپی کے قلعے میں چھوڑ دیے گئے۔ دہلی کی فوج نے کالپی کے قلعے کا محاصرہ کرلیا اور وہاں کئی دنوں تک گولیوں[2] کا مقابلہ ہوتا رہا۔ بالآخر کالپی کا قلعہ زیر ہوگیا اور شہر کو لوٹا کھسوٹا گیا۔ کثیر مال غنیمت دہلی کی فوجوں کے ہاتھ لگا۔

سلطان ابراہیم نے آگرہ کے دفاع کے لیے ملک آدم کاکر کی ماتحتی میں ایک فوج روانہ کی۔ جب جلال آگرہ کے قریب پہنچا تو اس نے ابراہیم کی فوج کے ذریعے کالپی کی بربادی کے انتقام میں شہر کو تاراج کرنے کا ارادہ کیا۔ ملک کاکر نے حالات پر چالاکی سے قابو پایا اور آگرہ کے خلاف جلال کے حملے کو ٹالنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد ہی ملک اسمٰعیل جلوانی، کبیر خاں لودی اور بہادر خاں نوحانی کی ماتحتی میں کمکیں پہنچ گئیں۔ اس کے بعد ملک آدم کاکر نے موثر اقدام کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے سخت رویہ اختیار کرنے سے پہلے امن کی ایک درخواست کرنا بہتر سمجھا۔ اس نے جلال کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ اپنے چھتر، آفتاب گیر، نقارے، سکے اور بادشاہت کی دیگر نشانیوں سے دستبردار ہوجائے اور ایک عام ملک کی طرح رہنا منظور کرلے تو وہ سلطان ابراہیم سے کالپی کی جاگیریں اسے واپس دلانے کی درخواست کرے گا۔ جلال نے ان ذلت آمیز شرائط کو منظور کرلیا اور ملک آدم کاکر کے حق میں ان نشانات سے دستبردار ہوگیا۔ کاکر یہ اطلاع سلطان ابراہیم کے پاس اٹاوہ لے گیا۔ ابراہیم نے جلال کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور بذات خود جلال کی طرف روانہ ہونے اور اس کا صفایا کردینے کا فیصلہ کیا۔ جب جلال کو ابراہیم کے ارادے کی اطلاع ہوئی تو وہ گوالیار بھاگ نکلا اور اس کے راجہ سے پناہ مانگی۔ ابراہیم کچھ دنوں آگرہ میں ٹھہرا اور وہاں کے معاملات درست کیے۔ اس نے ہیبت خاں گرگ انداز، کریم داد اور دولت خاں اندر کو دہلی کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ شیخ زادہ منجھو کو چندیری کی گورنری (ولایت) پر مقرر کیا اور مالوہ کے سلطان ناصرالدین خلجی کے ناتی سلطان محمد کو بھی بلا بھیجا۔

اس کے بعد ابراہیم نے گوالیار پر حملے کا اور جلال کی سرزنش کا فیصلہ کیا۔ گوالیار کو زیر کرنے کے لیے تیس ہزار گھوڑ سواروں اور ساڑھے تین سو ہاتھیوں پر مشتمل ایک فوج روانہ کی گئی۔ ابراہیم نے بھیکن خاں لودی، جلال خاں لودی، خضر خاں نوحانی اور خان لودی کی ماتحتی میں مزید کمکیں بھیجیں۔ جیسا کہ قسمت کو منظور تھا، گوالیار کے راجہ مان کا اسی وقت انتقال ہوگیا۔ اعظم ہمایوں سروانی نے قلعے کا محاصرہ کرلیا اور اسے زیر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جلال پہلے تو مالوہ بھاگا لیکن جب اسے محمود کا سلوک پسند نہ آیا تو وہ کڑا کٹنگا کی جانب مڑ گیا۔ راستے میں وہ بھیلوں اور گونڈوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا جنھوں نے اسے گرفتار کرلیا اور سلطان ابراہیم کے پاس بھیج دیا۔ اسے اس کے دوسرے بھائیوں کے

ساتھ ہانسی کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن بعد میں ابراہیم کے کچھ حمایتیوں کے مشورے پر اسے مار ڈالا گیا۔

اپنے امرا کے ساتھ تعلقات

ابراہیم اپنے امرا اور ملکوں کے ساتھ اچھے تعلقات برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے ناقابل برداشت رویے نے انھیں برانگیختہ کر دیا اور اس کے ارادوں کے متعلق ان کے دماغوں میں اندیشہ پیدا کر دیا۔

میاں بھوا لودی سلطنت کا ایک پرانا اور ممتاز امیر تھا۔ سکندر لودی اس کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس نے عدلیہ کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے تھے۔ اپنے بڑھاپے کی بنا پر وہ پہلی کی سی کارگزاریوں کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہ دے پایا۔ سلطان نے اسے ملک آدم کاکر کے زیر نگرانی قید میں ڈال دیا۔ اس کے فرائض، اس کی جاگیر اور اس کے امتیازات، اس کے بیٹے کو منتقل کر دیے گئے۔ قید میں میاں بھوا کی موت نے اس کے خاندان میں ابراہیم کے خلاف ایک گہری نفرت پیدا کر دی اور قدیم افغانی امرا کو بھی متنفر کر دیا۔

ابراہیم کا اپنے قدیم امرا پر اعتماد رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اور یکے بعد دیگرے اس نے ان میں سے بیشتر کو قید میں ڈال دیا۔ اعظم ہمایوں سروانی کو جو گوالیار کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اور اسے تقریباً سر کر لیا تھا، اچانک آگرہ بلا لیا گیا اور قید میں ڈال دیا گیا۔ جب اعظم ہمایوں کے بیٹے اسلام خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کڑا مانک پور میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس نے اپنے والد کی تمام جائداد اپنے کنٹرول میں لے لی اور احمد خاں کو اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں نہ لینے دیا۔ احمد خاں نے اس کو للکارا لیکن اس کو شکست ہوئی۔ سلطان نے اس کی سرزنش کے لیے ایک فوج بھیجنے کے متعلق سوچا لیکن اسی اثنا میں اعظم ہمایوں لودی اور سعید خاں چپکے سے اپنی لکھناؤتی کی جاگیروں کی طرف بھاگ نکلے۔ انھوں نے اسلام خاں سے خط و کتابت کی اور سلطان کے خلاف ایک مشترک اقدام کا منصوبہ بنایا۔ ابراہیم نے احمد خاں (اعظم ہمایوں لودی کے بھائی) حسین فرملی کے بیٹوں، مجلس عالی شیخ زادہ محمود فرملی، علی خاں، غلی خان خاناں فرملی، مسند عالی نجاری خاں فرملی، دلاور خاں سارنگ خانی، قطب خاں (غازی خاں بلوتی)، بھیکن خاں نوحانی، سکندر خاں (ملک آدم کا بیٹا) اور دیگر لوگوں کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج اسلام خاں اور سرکش امرا سے نمٹنے کے لیے بھیجی لیکن جب یہ فوج بنگر مئو کے قریب پہنچی تو اعظم ہمایوں لودی کا خاصہ خیل، اقبال خاں، پانچ ہزار گھوڑ سواروں اور چند ہاتھیوں کے ساتھ گھاٹ سے باہر آیا شاہی فوجوں پر حملہ کر کے اس نے انھیں تتر بتر کر دیا۔

شکست کی اس خبر نے ابراہیم کے حواس باختہ کر دیے اور اس نے اعلان کیا کہ وہ امرا جو باغیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر واپس لوٹے ہیں، اس وقت تک مطعون رہیں گے جب تک وہ ان باغی امرا کو جن کی قیادت اسلام خاں کر رہا ہے، شکست دے کر اپنے عزت و مرتبہ کو دوبارہ حاصل نہ کر لیں۔ اس نے ان کی فوجوں کو تقویت پہنچانے کے لیے مزید فوجیں بھیجیں۔ باغی فوج تقریباً چالیس ہزار گھوڑ سواروں اور پانچ سو ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس سے قبل کہ ان فوجوں میں تصادم ہو ایک ممتاز بزرگ شیخ بخاری نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور یہ بات طے ہوئی کہ اگر سلطان ابراہیم، اعظم ہمایوں سروانی کو رہا کر دے تو وہ لوگ اس کی مخالفت پر مصر نہ رہیں گے اور کسی دوسرے علاقے میں چلے جائیں گے۔ یہ معاہدہ ہو گیا تو دونوں فوجیں علاحدہ ہو گئیں لیکن سلطان نے اس سمجھوتے کو منظور نہ کیا۔ اس نے بہار کے گورنر دریا خاں نوحانی، نصیر خاں نوحانی اور شیخ زادہ فرملی کو احکامات جاری کیے کہ وہ باغیوں کے خلاف روانہ ہوں اور ان کا مواخذہ کریں۔ نتیجتاً ایک خوں ریز جنگ ہوئی اور دونوں جانب بے شمار سپاہی مارے گئے۔ بالآخر شاہی فوجیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ اسلام خاں میدان جنگ میں مارا گیا اور دریا خاں نوحانی کے ملازموں نے سعید خاں لودی کو گرفتار کر لیا۔ زبردست مال غنیمت دہلی کی فوجوں کے ہاتھ لگا۔ سلطان نے اس فتح کا جشن منایا اور صدقہ و خیرات میں کافی رقمیں تقسیم کیں۔ یہ امرا کے خلاف ایک زبردست فتح تھی۔

تبھی اعظم ہمایوں سروانی اور میاں بھوا کا قید میں انتقال ہو گیا اور بہار کے گورنر دریا خاں نوحانی اور امیر الامرا خاں جہاں لودی اور حسین فرملی نے بغاوت کر دی۔ چندیری کے گورنر حسین فرملی کو سلطان کے اشارے پر قتل کر دیا گیا۔ اس بات نے امرا کو مزید مخالفت و دشمنی پر آمادہ کر دیا کیونکہ انھوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی کہ سلطان تمام ذرائع سے ان کا صفایا کر دینے کے درپے ہیں۔

اس کے فوراً بعد ہی دریا خاں نوحانی کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا بہادر تمام باغیوں کے لیے ایک مرکز اجتماع بن گیا۔ بہادر نے بڑے پیمانے پر بہار میں باغیانہ رجحانات برانگیختہ کیے اور تقریباً ایک لاکھ گھوڑ سواروں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اس نے آزادی اختیار کر لی اور سلطان محمد کی حیثیت سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے نام پر خطبہ پڑھا گیا اور سکے جاری کیے گئے۔ سلطان ابراہیم کی فوج سے شکست کھانے کے بعد غازی پور کا گورنر نصیر خاں نوحانی بھی بہار کے بہادر خاں سے جا ملا۔ اس طرح بہادر کی پوزیشن مزید مستحکم ہو گئی۔ ابراہیم نے اس سے نمٹنے کے لیے ایک فوج روانہ کی۔

سلطان نے اپنے امرا کے شکوک و شبہات برانگیختہ کر دیے تھے اور ان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے بغاوت کر دیں۔ لاہور کا گورنر دولت خاں لودی کا ایک بیٹا، جسے اس زمانے میں

ابراہیم کے پاس آنے کا اتفاق ہوا تھا یہ دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا تھا کہ سلطان سلطنت کے تمام ممتاز امرا کے خلاف اقدام کا ارادہ کر رہا ہے۔ قید میں ڈال دیے جانے کے خوف سے وہ چپکے سے اپنے باپ کے پاس پہنچا اور اسے حالات سے باخبر کیا۔ دولت خاں نے ابراہیم کے خلاف ایک تحریک منظم کرنی شروع کردی اور پنجاب کے تمام امرا اور جاگیرداروں کی حمایت حاصل کرلی۔

بابر کو دعوت اور پانی پت کی جنگ

ابراہیم سے متنفر ہوکر پنجاب کے امرا نے بابر کو کابل خط لکھا اور اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ سکندر لودی کا بھائی عالم خاں بذات خود اس مقصد کے لیے کابل گیا۔ بابر نے عالم خاں کے ساتھ اپنے چند امرا حالات کے جائزے کے لیے بھیجے۔ ان امرا نے سیال کوٹ، لاہور اور دیگر علاقوں کو فتح کرلیا اور بابر کو حالات سے باخبر کیا، جو یکم ربیع الاول 932ھ مطابق 16 دسمبر 1525 میں ہندوستان کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ جب عالم خاں لاہور پہنچا تو اس نے اس بات پر زور دیا کہ چونکہ مغل اس کی دعوت پر آئے تھے لہٰذا دہلی کو فتح کرنے کے بعد اسے وہ اس کے سپرد کردیں۔ عالم خاں اور مغلوں میں اس بات پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ لہٰذا عالم خاں چالیس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ دہلی روانہ ہوا اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ جب ابراہیم کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اسّی ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج کی سرکردگی میں آگرہ سے چلا۔ عالم خاں نے دہلی کا محاصرہ چھوڑ دیا اور ابراہیم سے جنگ کے لیے تیار ہوا۔ اس نے ایک شبخون مارا اور ابراہیم کی فوجوں کو تتر بتر کردیا لیکن ابراہیم نے جو پانچ یا چھ ہزار سپاہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ خیمے سے باہر مقیم تھا، صبح کو عالم خاں کی فوجوں پر حملہ کردیا۔ عالم خاں کو شکست ہوگئی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا، اس کے بیشتر سپاہیوں کو مار ڈالا گیا۔

اسی اثنا میں بابر لاہور پہنچ چکا تھا۔ دولت خاں اور غازی خاں اپنے وعدے سے پھر گئے اور ملوت(3) چلے گئے۔ میر خلیفہ نے عالم خاں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اس کے ساتھ ہوجائے۔ بابر نے سنام اور سامانہ کی جانب پیش قدمی کی اور تردی بیگ کو چار ہزار گھوڑ سواروں کی سرکردگی میں مقدمتہ الجیش کی حیثیت سے دہلی کی جانب روانہ کیا۔ ابراہیم نے داؤد خاں کو دس ہزار گھوڑ سواروں اور کچھ ہاتھیوں کے ساتھ تردی بیگ کے مقابلے کے لیے روانہ کیا، جس نے داؤد خاں کی فوج پر رات میں اچانک حملہ کردیا۔ داؤد خاں کے بیشتر آدمیوں کو مار ڈالا گیا اور خود داؤد خاں کو گرفتار کرلیا گیا۔

جب ابراہیم کو داؤد خاں کی شکست کی خبر موصول ہوئی تو اس نے بذات خود روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ ایک لاکھ گھوڑ سوار سپاہیوں اور پانچ ہزار ہاتھیوں کی ایک فوج اس کی ماتحتی میں روانہ ہوئی۔ اس کے علاوہ پاپیادہ فوج کی ایک بڑی تعداد اور آتشی اسلحے وغیرہ بھی تھے۔ بابر کی فوج آٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ لہٰذا اس نے جلد ہی یہ سمجھ لیا کہ لودی فوج کی زبردست تعدادی بالادستی کو غیر موثر بنادینے کی صرف یہی صورت ہے کہ کسی ایسے مقام پر جنگ لڑی جائے جو اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اس کے موافق ہو اور وہ اپنے سواروں اور توپ کے دستوں کو موثر طور پر کام میں لاسکے۔ بابر نے کامیابی کے ساتھ یہ دونوں مقاصد حاصل کرلیے۔ ابراہیم کی فوجیں ٹھیک پانی پت کے جنوب میں تھیں۔ مغل فوج دو منزلوں میں آسانی کے ساتھ شہر پہنچ سکتی تھی اور پانی پت کے گھروں اور عمارتوں کو اپنے داہنے بازو کے لیے بطور پناہ استعمال میں لاسکتی تھی۔(4)

بابر نے احتیاط کے ساتھ اپنی فوجوں کی ترتیب کا منصوبہ بنایا۔ خام چمڑے کی رسیوں سے بندھے ہوئے تقریباً سات سو چھکڑوں کو کام میں لاکر اس نے اپنے کمزور محاذ کو کثرت تعداد کے دباؤ سے بچایا۔ ہر چھ یا سات چھکڑوں کے بعد ایک دفاعی پشتہ (Breast work) تھا جہاں توپ خانے کے دو ممتاز افسروں ـــ استاد علی اور مصطفیٰ ـــ کی عمومی نگرانی میں بندوقچیوں اور توپچیوں (Artillery-man) کو متعین کیا گیا تھا۔ یہ تمام تیاریاں کرنے کے بعد بابر دو منزل آگے بڑھا اور 12 اپریل 1526 کو پانی پت کے شہر جا پہنچا۔ شہر نے اس کے داہنے بازو کو حفاظت مہیا کی اور بائیں بازو کی حفاظت ایک خندق کھود کر اور کٹے ہوئے درختوں کی اباطی (Abatis) کی تعمیر کے ذریعے کی گئی۔ دفاعی پشتوں اور چھکڑوں کی ایک قطار کے ذریعے قلب لشکر کو تقویت پہنچائی گئی لیکن صف میں کچھ کچھ دوری پر خالی جگہیں چھوڑ دی گئیں جو اتنی تھیں کہ پچاس یا سو گھوڑ سوار اس میں سے نکل کر حملہ کرسکیں۔

Rushbrook William کا خیال ہے کہ "چھکڑوں کی قطار دفاعی سے زیادہ جارحانہ تدبیر تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی صفوں کو ایک لمبے محاذ پر الجھائے رکھا جائے تاکہ اس کی فوج کے دونوں کناروں پر بآسانی حملہ کیا جاسکے۔ توپچیوں اور بندوقچیوں کے لیے یقیناً اس نے ایک پناہ گاہ کا کام کیا لیکن اس کو کسی بھی اعتبار سے ایک (Laager) یا قلعہ نہیں کہا جاسکتا۔"(5)

12 اپریل کے بعد تقریباً ایک ہفتے تک اور افغانی فوجیں حقیقی جنگ کا آغاز کیے بغیر میدان میں کھڑی رہیں۔ 19 اپریل کو بابر نے حملہ کی ایک غیر موثر کوشش کی۔ بہرحال چند دنوں بعد جنگ شروع ہوگئی۔ بالکل تھکی ہوئی ایک جماعت میں جکڑے ہونے کے باعث ابراہیم کے آدمی نہ آگے بڑھ سکتے تھے اور نہ ہی پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ جنگ صبح چھ بجے شروع ہوئی اور دوپہر تک افغانی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں افغانی لاشوں سے، جن کے درمیان ابراہیم کی لاش بھی تھی، پانی پت کا میدان جنگ ڈھک گیا۔ نعمت اللہ کا خیال ہے کہ "سلطان ابراہیم کے ماسوا ہندوستان کا کوئی سلطان میدان جنگ

میں نہیں مارا گیا۔‘‘[6] دہلی کی سلطنت جس کی پیدائش 1192 میں ترائن کے میدان جنگ میں ہوئی تھی، اس نے 1526 میں، چند میل دور، پانی پت کے میدان جنگ میں اپنی آخری سانس لی۔

□□□

حواشی:

1. نعمت اللہ، تاریخ خان جہانی، جلد اوّل ص ص 37-236
2. (نوٹ: محمد امام الدین (مولفہ) تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی، ص 239 ’’چند روز جنگ توپ وتفنگ‘‘۔
3. سید محمد امام الدین (مولفہ) تاریخ خاں جہانی ومخزن افغانی ص 256، قلعہ بلوت، لکھا ہے۔
4. رش بروک ولیمس، (این امپائر بلڈر آف دی 16ویں سینچوری، ص 38-126 (An Empire Builder of the 16th Century)) نے جنگ کا ایک دلچسپ اور تفصیلی بیان پیش کیا ہے۔
5. ایضاً، ص130
6. تاریخ خان جہانی جلد اوّل، ص259

یادگار کہتا ہے (تاریخ شاہی ص98) کہ لاشوں کے بیچ ابراہیم کو دیکھ کر بابر بہت متاثر ہوا۔ اس نے اس کے سر کو دھول سے اٹھا لیا اور بڑی عزت واحترام سے اس کی لاش دفن کی اور اس کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے اس نے قند حلوہ تقسیم کیا۔

□□□

جدید

ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئرپرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

ٹیکنک اور ترتیب وتقسیم کے اعتبار سے ’’جدید۔ ہندی اردو لغت‘‘ اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم وجدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی ومفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

اقبال کی کہانی (پانچواں ایڈیشن)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ ہی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

(ہماری مطبوعات سے)

مغنی تبسم

فانی کی شخصیت

فانی کا شمار اردو کے منفرد غزل گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی معدودے چند آوازوں میں ان کی بھی ایک آواز تھی۔ ان کے رویّوں اور عمل سے جس کا اظہار ہوتا رہا، اس مطالعے کے بنیادی اجزا نسل، بچپن کی تربیت اور ماحول کے اثرات ہیں۔

شوکت علی خاں فانی نسلاً پٹھان تھے۔ جمال الدین افغانی، جے. پی. فیریر اور دوسرے مورخوں نے افغانوں کی نسلی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے جہاں ان کی شجاعت، خودداری، آزادی پسندی، مذہبی رواداری اور کشادہ مزاجی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، وہیں ان کے مزاج کی سیمابیت، مہم جوئی، انتہا پسندی، جذباتیت، ظلم، بے رحمی، بے وفائی اور جذبۂ انتقام جیسی صفات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا اور تاریخی و سماجی موثرات نے انھیں تعیش پسند بنا دیا تھا۔ نسلی خصوصیات کی توریث کا عمل بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ ماحول، بچپن کی تربیت، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات بعض خصوصیات کو دبا دیتے ہیں اور بعض کی صورت اس طرح بدل دیتے ہیں کہ انھیں پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔

فانی نے اپنے افغانی النسل ہونے کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ انھیں اپنے والد کی سیرت میں جو اوصاف نمایاں نظر آئے وہ ان کی شرافت، دیانت، غیرت اور جرأت ہیں۔ فانی کے تذکرہ نگاروں نے ان کے کردار کی جس خصوصیت پر زور دیا ہے وہ ان کی خودداری ہے۔ فانی کے کردار کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس وصف کی حقیقی نوعیت کیا تھی۔ جب ہم فانی کی سرگذشت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس جذبے کا اظہار اکثر منفی سمت میں ملتا ہے۔ یہ بندگی میں آزاد و خود بیں بنانے والی خودداری ہے جو مسافر کو منزل سے الٹے قدموں لوٹا دیتی ہے۔ اس میں درِ کعبہ کھولنے کی جرأت مفقود ہے۔ فانی کی خودداری میں بظاہر غرور کا شائبہ نہ تھا لیکن وہ انکسار اور عاجزی کا اظہار بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ خوشامد سے بالعموم پرہیز کرتے رہے اور اس کی وجہ سے بنتے کام بگاڑ لیے، لیکن اپنے محسنوں کی مدح و توصیف اس طرح کی ہے کہ خوشامد کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے۔ فانی کو اپنے وقار کا بے حد پاس تھا۔ وہ اتنے حساس واقع ہوئے تھے کہ بعض اوقات محض مفروضوں اور بے بنیاد قیاسوں پر کسی معاملے کو عزتِ نفس کا مسئلہ بنا لیتے تھے اور اپنے فوری ردِ عمل کا اظہار کر دیتے تھے۔ آگرے کے آخری زمانۂ قیام میں وہ سخت مالی مشکلوں کا شکار ہو گئے تھے۔ ایک دوست نے انھیں ایک نواب صاحب کے لڑکے کی اتالیقی پر مامور کرانا چاہا لیکن انھوں نے محض اس بنا پر اس خدمت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور وہاں سے چلے آئے کہ انھیں جو تنخواہ دی جا رہی تھی وہ انگریزی کے استاد سے کم تھی۔ میر اور غالب کی زندگی میں بھی ایسے واقعات مل جاتے ہیں۔ فانی کا جذبۂ خودداری غالب سے مختلف تھا اور میر کی طرح اس جذبے میں شکست خوردگی کا احساس بھی شامل تھا۔ ایک بار ہزیمت اٹھا کر پست ہمت ہو جانا، شاید یہ بات نسلی تقدیر سے ان کے حصے میں آئی تھی۔ زک اٹھانا ان کے لیے عزتِ نفس کے مغائر تھا اور شکست کے خوف نے انھیں مصیبتوں کا متحمل اور صبر وضبط کا خوگر بنا دیا تھا۔

افغانوں کے مزاج کی متضاد خصوصیات کی نمائندگی حافظ رحمت خاں اور غلام قادر روہیلہ کے کرداروں میں ہوتی ہے۔ ایک نے عزتِ نفس کی خاطر اپنی جان قربان کردی، دوسرے نے جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر بے وفائی، بے رحمی اور ظلم کا راستہ اختیار کیا۔ ان متضاد اعمال اور نتائج کا نفسیاتی محرک مشترک ہے اور وہ ہے عشقِ ذات جو متذکرہ کرداروں میں سادیت (Sadism) یا اس کی مرتفع شکل خود آزاریت (Masochism) کا روپ بن کر ظاہر ہوئی۔ فانی کی خودداری بھی خود آزاریت سے پیدا یا اس پر منطبق ہونے والے ''عشقِ ذات'' (Narcism) کا مظہر تھی۔ فانی کے مزاج اور کردار کی اس خصوصیات کا تجزیہ کرنے کے لیے سب سے پہلے ان کے بچپن اور ماحول پر نظر ڈالنی چاہیے۔

فانی کے والد شجاعت علی خاں ایک سخت گیر اور کھرے پٹھان تھے۔ حیرت بدایونی نے ان کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے:

''......قوم کے پٹھان، مذہب کے اہلِ حدیث اور پیشے کے زمیندار، اس کے اوپر سے داروغہ جی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نیم چڑھا کریلا بھی تھے اور سونے پر سہاگہ بھی، اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی خصوصیات کا جامع انسان کیسا تند مزاج، کتنا درشت خو اور کس قدر کٹر ہوگا۔''

''فانی بدایونی'' سے ماخوذ، مصنف: مغنی تبسم/صفحات. 499 ، قیمت : -/210روپے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ہمیں فانی کے بچپن اور ان کی نوجوانی کے جو واقعات معلوم ہو سکے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد سے بہت ڈرتے اور گھبراتے تھے۔ شجاعت علی خاں گو محبت پدری سے عاری نہیں تھے لیکن اولاد کی تربیت اور تعلیم کے خیال سے کبھی ضرورت سے زیادہ سختی برتنے لگتے۔ انھیں شاعری سے نفور تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ فانی شعر کہنے لگے ہیں تو برافروختہ ہو کر ان کی بیاض نذرِ آتش کردی اور اس مشغلے سے دور رہنے کی سخت تاکید کی۔ والد کے خوف سے فانی چھپ کر شعر کہتے رہے اور ایک مدت تک نہ تو کسی مشاعرے میں شریک ہوئے اور نہ رسالوں میں اپنا کلام چھپوایا۔ اس وقت کے طرزِ معاشرت میں باپ کی حیثیت خاندان میں حاکمِ اعلیٰ کی ہوتی تھی جو محبت کیے جانے سے زیادہ تعظیم کے قابل ہستی ہوتی تھی۔ اس ماحول میں شجاعت علی خاں اور فانی کے درمیان جو فاصلہ تھا اس کا اندازہ ضیا احمد بدایونی کے بیان کردہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے:

''......جب وہ بریلی کالج میں زیرِ تعلیم تھے، ان کی والدہ علیل ہو گئیں، جس پر والد نے فانی کو بدایوں طلب کیا۔ یہ کچھ دیر کر کے آئے تو والد نے نہایت سخت سست کہا، مگر اس خدا کے بندے نے آنکھ اوپر نہ اٹھائی اور بکمالِ ادب کے ساتھ دونوں سے اپنی کوتاہی کی معافی مانگی۔''

اس زمانے میں متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں میں یوں بھی شوہر اور بیوی میں حاکم و محکوم کا سا تعلق ہوتا تھا۔ شجاعت علی خاں کے مزاج کی کیفیت کا لحاظ کرتے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ فانی کی والدہ انھیں وہ محبت نہ دے سکی ہوں جس کے لیے وہ فانی کے لیے خارج میں ایک چاہنے اور چاہے جانے والا وجود بن سکتیں۔ اس سلسلے میں فانی کے ابتدائی کلام میں عورتوں کی بے چارگی اور مردوں کے مظالم کا ذکر قابلِ توجہ بن جاتا ہے:

دکھ عورتوں کے سنو زبانی ان کی
سننے کے قابل ہے کہانی ان کی
ٹیڑھے ہیں تو کون نکل نکالے ان کے
سیدھے ہیں جو مرد، مہربانی ان کی

اور

محکوم ہے حاکم کی حکومت کا شکار
کم زور، زبردست کی قوت کا شکار
تھوڑی ہے جو ہو عورتوں پر سختی
جب تک ہیں یہ مردوں کی جہالت کا شکار
(دیوان قدیم)

ان اشعار سے اس گھریلو فضا کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے جس میں فانی نے پیدائش کے بعد ابتدائی سانسیں لی ہوں گی۔ فانی کی ''نرگسیت'' کی بنیاد، جو آگے چل کر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئی ایسے ہی حالات میں تلاش کی جاسکتی ہے۔

فانی کے بچپن اور جوانی کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے ماں باپ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے ان کی مرضی کو اپنے ارادوں اور اپنی خواہشوں پر مقدم رکھا۔ شجاعت علی خاں اور فانی کے خیالات، جذبات اور رجحانات میں بڑا بعد تھا۔ کتب کی تعلیم ختم کر کے جب فانی نے کالج میں داخلہ لیا اور وہ دنیا دیکھی جو شجاعت علی خاں نے نہیں دیکھی تھی تو وہ ذہنی اعتبار سے اپنے والد سے اور بھی دور ہوتے گئے، لیکن اس اختلاف سے جو امکانی تصادم واقع ہو سکتا تھا، فانی نے ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کی، اس لیے کہ وہ اپنے والدین کی محبت اور ہمدردی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ دوسری طرف شجاعت علی خاں، فانی کو وہ کچھ بنانا چاہتے تھے جو خود نہیں بن سکے تھے لیکن وہ یہ دیکھنے سے قاصر رہے کہ فانی کیا بن سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال نے جہاں فانی کو دروں میں بنا دیا وہیں ان کی زندگی میں، اَن جانے خوف کا عنصر بھی شامل کر دیا۔

فانی کے کردار کی صحت مند تعمیر میں ہمیشہ یہ خوف حائل اور مانع رہا کہ ''کہیں لوگ میرے بارے میں بری رائے قائم نہ کریں، اور وہ دوسروں کی نظروں میں اچھا انسان دکھائی دینے کی شعوری کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی شرافت اور خودداری کا رُخ دنیا کے آگے پیش کیا۔ اس کے لیے انھیں اپنے کئی موقتی جذبات کا گلا گھونٹنا پڑا اور انھوں نے ایذائیں اور مصیبتیں اٹھائیں۔ فانی کے کبھی دوست اور جاننے والے ان کی سیرت کے اس وصف کو سراہتے ہیں۔ اس وصف کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار میں بہت محتاط واقع ہوئے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انھیں اپنی زندگی میں دوستوں کی غمازی کے بعض ایسے تلخ تجربے ہوئے تھے جن کی یاد ان کے ذہن سے کبھی محو نہ ہو سکی تھی۔ ''دیوان فانی'' میں ایک نظم غمازی کی مذمت میں ہے، اس کے ساتھ یہ قطعہ بھی درج ہے:

میرے اشعار پر اخلاقی غمازی پر
سن کے جو مجھ سے بگڑ جائے اسے کیا کہیے
اس کو دیوانہ، مری نظم کو 'ہجو' کیجیے فرض
یا اسے چور کی داڑھی، اسے تنکا کہیے
(دیوان قدیم)

ایسے ہی تجربوں نے انھیں عام زندگی میں اس درجہ محتاط بنا دیا تھا کہ وہ کسی سے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے۔ خطوط میں بھی وہ احتیاط کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ حکیم مختار احمد کے نام ایک خط کی یہ عبارت مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے:

''......حیدرآباد کا قصہ بلا تامل قطع کرو۔ اس مشورے کا سبب بھی زبانی کہوں گا۔''

اب میکش اکبرآبادی کے الفاظ میں فانی کی یہ تصویر ملاحظہ کیجیے:

’’فانی صاحب کا سمجھنا مشکل تھا۔ ان کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔ ان کا چہرہ سنجیدہ اور پروقار تھا۔ نہ ان کے چہرے سے، نہ ان کی آنکھوں سے ان کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ سب کو دیکھ لیتے مگر دوسرے لوگ یہ نہ سمجھتے کہ انھوں نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا۔ سنجیدگی اور وقار کے ساتھ ایک اور کیفیت ان پر حاوی رہتی۔ میں اس کیفیت کا نام نہیں جانتا مگر جیسے وہ ہر بات کو راز سمجھ رہے ہیں اور راز کی طرح ظاہر کر رہے ہیں، جیسے انھیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ کوئی ان کی بات سن تو نہیں رہا ہے۔‘‘

دوسروں کی نظر میں اچھا انسان بننے کی کوشش میں ’’خوف‘‘ کے علاوہ ’’خودنمائی‘‘ کے جذبے کو بھی دخل تھا جو فانی کی زندگی میں ’’خودداری‘‘ کے پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔ فانی کو اپنی خاندانی شرافت اور امارت کا شدید احساس تھا۔ یہ احساس ان کی ذات سے اس درجہ پیوست ہو گیا تھا کہ وہ کبھی اپنے وجود کو اس نسبت سے جدا کر کے نہیں دیکھ پاتے تھے۔ یہاں تک کہ انتقال سے چند ماہ پہلے جب انھوں نے مدیر ’’نگار‘‘ کی فرمائش پر اپنی زندگی کے مختصر حالات قلم بند کیے تو اپنے افغانی النسل ہونے، اجداد کی دربار دہلی سے وابستگی اور پردادا کی امارت کا ذکر کرنا نہیں بھولے۔ سبطین احمد نے فانی کی خودنمائی اور انفرادیت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

’’فانی کی فطرت اپنی انفرادیت ہر جگہ نمایاں کرنا چاہتی تھی۔ ان کا طرز بود و باش اور ان کا اندازِ گفتگو ایک شانِ انانیت رکھتا تھا۔ لباس میں تکلف ہوتا تھا۔ کمرہ بہت آراستہ رکھتے تھے۔ مردانے میں آتے تو کبھی بغیر اچکن پہنے نہ آتے۔ بات کرتے تو آہستہ۔ کبھی غصہ نہ آتا۔ بازاری الفاظ یا سوقیانہ کلمے منہ سے نہ نکلتے۔ کہیں ہوتے ہر صحبت میں نمایاں نظر آتے۔

فانی کا طرزِ گفت و شنید بڑے بڑے خودسروں کو ان کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ خودنمائی کی ایک شان یہ بھی تھی کہ وہ بڑے شاہ خرچ تھے۔ اگر جیب یاوری کرتی تو وہ شہزادوں کی سی زندگی بسر کرتے۔ لکھنؤ وکالت کرنے گئے تو جاتے ہی سوا سو روپئے ماہوار کی کوٹھی کرائے پر لی۔ ممبئی گئے...... چند روزہ قیام میں کئی ہزار اڑا دیے۔‘‘

فانی کے اس جذبۂ خودنمائی میں بھی اس عشقِ ذات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی تشکیل میں اس معاشرے اور ماحول کا بھی بڑا حصہ ہے جس میں انھوں نے اپنا بچپن بسر کیا۔ فانی اسلام نگر میں پیدا ہوئے تھے جہاں ان کے والد پولیس انسپکٹر تھے۔ ایک چھوٹے سے قصبے میں پولیس انسپکٹر اپنے وقت کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اسلام نگر سے بدایوں آکر شجاعت علی خاں اپنی آبائی حویلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ سیاسی تبدیلیوں نے اگرچہ اس خاندان کے سماجی مرتبے اور معاشی حالت کو سخت دھکا پہنچایا تھا، اس کے باوجود جو جائداد بچ رہی تھی وہ متوسط درجے کی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی تھی۔ خاندانی اور نسلی شرافت کا احترام ابھی سماج میں باقی تھا۔ اس ماحول میں فانی کی ابتدائی نشو و نما ہوئی اور اس کے زیر اثر ان کی Status Personality تشکیل پائی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد بعض خاص حالات کے تحت فانی نے اپنے والد کے منشا کے خلاف ایک اسکول میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مدرسے کی چار دیواری کے اندر استاد کو عزت و احترام مل جاتا ہے لیکن معاشی حیثیت سے سماج میں وہ نہ صرف اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتا ہے بلکہ اس کی حیثیتِ عرفی بھی مُشتبہ رہتی ہے۔ اس مرتبہ پر قناعت نہیں کر سکتے تھے جو انھیں ایک مدرس کی حیثیت میں حاصل تھا۔ چناں چہ انھوں نے استعفیٰ دے کر قانون کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ وکالت کا کاروبار فانی سے کبھی نہیں چل سکا۔ رفتہ رفتہ انھیں اس پیشے سے نفرت سی ہو گئی۔ لیکن وکیل کے سماجی مرتبے نے انھیں اس پیشے سے وابستہ رہنے پر مجبور کیا اور رسالوں میں ان کا کلام ’’شوکت علی خاں فانی بی۔ اے، ایل ایل بی، وکیل‘‘ کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ فانی اس سماجی مرتبے سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ انھیں بعد کو شاعر کی حیثیت سے کافی عزت اور شہرت حاصل ہوئی لیکن عام لوگوں کی داد و تحسین سے انھیں کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے وہ مشاعروں سے دور بھاگتے رہے۔ شاعروں میں سماجی رتبے کے اعتبار سے داغ ان کے آئیڈیل تھے، وہ چاہتے تھے کہ انھیں بھی کوئی امیر کبیر قدرداں مل جائے اور وہ فکرِ معاش سے بے نیاز رہ کر صرف شعر کہتے رہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں پہنچ کر فانی نے خود اپنے الفاظ میں ان خوابوں کی تعبیر سی دیکھی جو (انھوں نے) شاہانِ مغلیہ کے درباروں سے متعلق دیکھے تھے۔ اپنے اس خیال کو مجسم ہوتے پایا جو بارہا (ان کی) قوتِ متخیلہ نے اُمراءِ سَلف کے درباروں کی نسبت (ان کے) دِل میں قائم کر رکھا تھا۔

مہاراجہ نے فانی کو ایسے وقت سہارا دیا جب کہ معاشی اعتبار سے وہ بے حد تباہ حال ہو چکے تھے۔ فانی زندگی بھر ان کے احسان مند رہے۔ پھر انھیں محکمۂ تعلیمات میں ملازمت مل گئی۔ اسی زمانے میں ان کی رسائی معظم جاہ بہادر کے دربار میں ہوئی۔ ایک نیم خودمختار ریاست کے شہزادے کی مصاحبت کے علاوہ ریاست کے رؤسا اور امرا کی رفاقت نے انھیں سچ مچ اس دنیا میں پہنچا دیا جہاں پہلے صرف عالمِ تصور میں ان کا گزر ہوتا تھا۔ یہی کشش تھی کہ کسی مالی فائدے کی امید کے بغیر وہ تا دمِ آخر اس دربار سے وابستہ رہے۔ اس سلسلے میں فانی کی زندگی کا یہ واقعہ نفسیاتی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے جسے تابش دہلوی نے اپنے ایک مضمون میں قلمبند کیا ہے:

’’ایک دفعہ (فانی نے) مجھ سے پوچھا: تابش تم پر کبھی ایسا بھی واقعہ گزرا ہے کہ تم اکثر آدمیوں کو، اکثر مقامات کو دیکھ کر ایسا محسوس کرتے ہو کہ یہ آدمی اور یہ مقام پہلے کہیں تم نے دیکھا ضرور ہے۔ میں نے کہا: ’ہاں، آدمیوں اور بعض واقعات کی حد تک تو ایسا محسوس ہوتا ہے، کہنے لگے: ’’میں دہلی کے لال قلعے

میں گیا اور دیوانِ خاص کے قریب جن عمارتوں میں سے ایک نہر بہتی ہے ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہ میرا محل ہے اور میں یہاں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ غرض یہ جذبہ مجھ پر اس قدر طاری ہوا کہ میں بے اختیار رو دیا اور بہت دیر تک وہاں بیٹھ کر ان مقامات کو دیکھتا رہا۔ وہاں سے اٹھ کر اپنی حماقت پر خوب ہنسا، تھوڑی دیر بعد کہنے لگے: 'بتا سکتے ہو کیا بات ہے؟ میں معذور ہوں، فرمایا: 'قرآن میں ایک آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہر روح کو جدید طور پر دوبارہ خلق کریں۔ شاید یہ دنیا اور اس دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھانے کے لیے خدا جانے کتنی دفعہ خلق کی ہو اور ہم سب بھی جدید طور پر خلق ہوئے ہوں اور پچھلی باتیں ایک خواب کی سی کیفیت لیے ہوئے محسوس کرائی جاتی ہوں کہ ہم نے یہ تمام چیزیں اس سے قبل ہی کہیں دیکھی ہیں، ذرا وقفے کے بعد کہا۔ ''واللہ اعلم بالصواب''

یہاں یہ سوال غور طلب نہیں ہے کہ آیا فانی تجدیدِ زندگی میں اعتقاد رکھتے تھے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ تجدیدِ زندگی کے احتمال کے ساتھ وہ خود کو پچھلے جنم میں تختِ دہلی پر متمکن دیکھ رہے تھے۔ اس ذہنی کیفیت کو جاننے کے بعد جو ان کے شاہانہ مزاج سے توافق رکھتی ہے، زندگی میں فانی کے بعض رویوں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور یہ بات تعجب خیز نہیں رہتی کہ انھوں نے اجداد سے ملی ہوئی دولت کس لیے ناعاقبت اندیشی کے ساتھ پانی کی طرح بہادی، ذہانت اور صلاحیت رکھنے کے باوجود کسبِ معاش کے موزوں وسائل سے مناسب طور پر استفادہ نہ کر سکے اور مقروض ہو کر ظاہری شان و شوکت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر نہ کر سکے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اپنے زمانے، ماحول اور حالات کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر پائے۔

فانی نے ایک ایسا زمانہ پایا جب کہ سماجی مراتب کا توریثی نظام ٹوٹ رہا تھا۔ نئے سماجی رشتے اور مراتب قائم ہو رہے تھے جن کی شکل پوری طرح واضح نہیں ہونے پائی تھی۔ تنظیمِ حیات کا کوئی خاکہ مربوط نہیں تھا۔ جیسا کہ رالف لنٹن نے لکھا ہے۔ ایسے حالات میں فرد کو ایک طرف تو انتخاب سے کام لینا پڑتا ہے، دوسری طرف وہ یہ بھروسا نہیں کر سکتا کہ اس کا انتخاب درست ہے اور یہ کہ معاملاتِ زندگی میں دوسروں کا جوابی رویہ وہی ہوگا جس کی وہ توقع رکھتا ہے۔ ایک خاص ماحول سے نکل کر جب فانی نے عملی دنیا میں قدم رکھا تو انھیں زندگی کے بارے میں اپنے تصورات کا شیش محل ٹوٹتا نظر آیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ معاشرتی اور معاشی قدریں تیزی سے بدل رہی ہوں کوئی شخص اپنے معیار کو بدلنا نہ چاہے تو اس کی اعصابی صحت کا برقرار رہنا ممکن نہیں۔ ایسی ہی صورتِ حال نے فانی کو سماجی خود آزاریت اور توہمی عصابیت (Obsessional Neurosis) کا شکار بنا دیا تھا۔ اس کے اثرات ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں نظر آتے ہیں۔ ''شاعری'' اور ''عزتِ نفس'' ان کی وہ کمزوریاں تھیں جن کی خاطر انھوں نے اپنی مادّی خوش حالی کی قربانی دی اور اس کے معاوضے میں اپنی خودداری، شرافت اور بلند کردار کی داد پا کر عشقِ ذات کے جذبے کو رام کیا۔ وہ ایک دبے ہوئے جذبۂ بغاوت کے ساتھ جبرِ تقدیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے رہے۔ امید و بیم کی حالت نے اتنا طول کھینچا کہ زندگی فقط انتظار کا نام بن کر رہ گئی۔ زندگی کے بعض حادثات نے ان کی نرگسیت کو مجروح کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ خود آزار بن گئے تھے۔ یہ مجروح نرگسیت کا اقتضا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر قابلِ حصول لذتوں کو ملتوی کرتے رہے یا ان سے راہ کترا کر نکل گئے۔ دیکھنے والوں نے اسے طبیعت کے استغنا پر محمول کیا حالاں کہ وہ دل سے زندگی کی مادّی مسرتوں کو آخری قطرے تک نچوڑ لینا چاہتے تھے۔

ایک غیر شعوری خوف نے انھیں حظ اٹھانے سے باز رکھا..... کہیں یہ لذتیں ختم نہ ہو جائیں اور میں ان سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤں۔ فانی طویل عرصے تک اس ''کیفیتِ التوا'' سے لذت ایذا اٹھاتے رہے اور جب حقیقی لذتوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو محسوس کیا کہ انھیں اتنا زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جی نڈھال اور قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ فانی کی سماجی خود آزاریت، توہمی عصابیت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ وہ اکثر یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے کام بن کر بگڑ جاتے ہیں۔ ہم جب ان کی زندگی کے واقعات میں اس کے اسباب تلاش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر وہ خود ہی اپنے تعیشات، تساہل یا توہمات کی وجہ سے اپنے کام بگاڑتے رہے۔ اپنی دانست میں وہ ایک غیور انسان کی طرح زندگی بسر کرنے کی امکانی کوشش کرتے رہے۔ ان کے اخلاقی معیارات، اقدار کے تصور اور وقتی خواہشوں کے پیچھے جو غیر شعوری عوامل کارفرما تھے، ان سے وہ خود بے خبر تھے۔ فانی کے نیوراسس کا اہم سبب یہی تھا کہ ان کی ''انا'' نے سماجی مطالبات سے مطابقت پیدا کرنے کے جو طریقے اختیار کیے وہ غلط اور نامناسب تھے۔ عصابیت نے ان کے مزاج کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ ہر لذت بے لذتی محسوس ہوتی تھی اور رد کر دی جاتی تھی۔ عصابیت رفتہ رفتہ ایک مستقل ذہنی فساد (Perversion) بن گئی اور وہ تکلیف میں لذت محسوس کرنے لگے۔ خود آزار بن گئے۔ معاشی عمل کا محرک کمزور پڑ گیا۔ فرائیڈ نے نرگسی کردار کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ اپنی خودداری کو برقرار رکھنے کے لیے پوری طرح دوسروں پر انحصار کرتا ہے۔ اس مزاج کے لوگوں کو تحفظ او راطمینان کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب وہ دوسروں کی طرف سے اپنے لیے محبت، احترام، اعانت اور حوصلہ افزائی محسوس کرتے ہیں۔ وہ ان بچوں کے مانند ہوتے ہیں جو ''ابتدائی نرگسیت'' کے انتشار پر خود کو معروضاتِ محبت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس طرح اپنی کھوئی ہوئی خودداری کو دوبارہ حاصل کر لیتے ہیں۔ تمدنی اعتبار سے یہ میلان بالعموم

ایسے افراد میں پایا جاتا ہے جن کی ابتدائی نشو ونما ایسے چھوٹے خاندانوں میں ہوتی ہے جن کا طرز بود و باش معاشرے کے عام طریقوں سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ بڑی عمر کو پہنچ کر وہ معاشرے میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ انھیں کوئی ایسا ہمدرد مل جاتا ہے جو ان کی ذات سے محبت کرتے ہوئے ان کی صلاحیتوں کا قدرداں ہو تو وہ اس کے ساتھ خاص جذباتی وابستگی پیدا کر لیتے ہیں۔ فانی کی معاشی تنگ و دو ایسے سہاروں کی تلاش تک محدود رہی۔ زندگی کے مختلف مرحلوں میں انھیں مولوی الطاف حسین، رائے چھمن پرشاد، مہاراجہ کشن پرشاد اور میر ہاشم علی خاں جیسے ہمدرد، رفیق اور سرپرست ملتے رہے۔ فانی جہاں کہیں رہے ان کا دائرۂ احباب محدود اور مخصوص رہا۔ وہ اپنے دوستوں کو عزیز رکھتے تھے اور جواب میں ان سے کچھ زیادہ ہی خلوص، بے غرضی زندگی کی تشنہ کامیوں اور محرومیوں سے عبارت ہے۔ جنسی زندگی پر معاشرے کے حالات، گھریلو ماحول اور ابتدائی تربیت کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ شکست خوردگی کا احساس فانی کو اپنے زمانے اور ماحول سے ملا تھا۔ بچپن میں خاندانی مناقشات اور والد کی سخت گیری کی وجہ سے انھیں صحت مند ذہنی فضا میسر نہیں آسکی تھی۔

فانی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اس زمانے میں ہم سن بچوں کے ساتھ کھیل کود کے مواقع کم حاصل رہے۔ ان حالات میں کسی ''نادیدہ دوست'' کا ان کے لیے حقیقی وجود بن جانا قرین احتمال ہے جو ڈاکٹر جیسر کے مطابق خود بچے کی دوسری ''انا'' یا اس کا ''ہم زاد'' ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں اردو اور فارسی کی عشقیہ شاعری کے مطالعے نے اس ''نادیدہ دوست'' کو ایک کم سن خیالی محبوب کی شکل دے دی۔ غالب کی طرح گیارہ برس کی عمر ہی میں فانی بھی عاشقانہ شعر کہنے لگے تھے۔ بنتِ عم سے فانی کی محبت اور اس کے الم ناک انجام کی روایت عام طور پر مشہور ہے۔ اس روایت کا یہ رخ قابل توجہ ہے کہ آگ دونوں طرف برابر نہیں تھی۔ عشق ایک کے لیے شعلۂ [illegible]ار تھا جس نے اس کے وجود کو خاکستر میں تبدیل کر دیا۔ دوسری طرف صرف دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جو فانی کو موم کی طرح پگھلاتی رہیں۔ اس حادثے کے بعد فانی کی شاعری ان کے والد کی مرضی سے انجام پا گئی۔ فانی کی ازدواجی زندگی میں بظاہر کوئی ناخوشگوار واقعہ نظر نہیں آتا لیکن ہم فانی کے اس رویے کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ شادی کے بعد زیادہ تر وہ بیوی اور خاندان سے دور رہے اور دور رہنے کی کوشش کرتے رہے۔ جہاں کہیں بھی رہے، جنسی آسودگی کا سامان فراہم کر لیا۔ اسی زمانے میں تقن جان اور نور جہاں یکے بعد دیگرے ان کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ ان معاشقوں میں چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کا پہلو نمایاں ہے۔ تقن جان، راجہ صاحب محمود آباد کی ملازم تھی، اس کے باوجود فانی سے محبت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ فانی اس سے نکاح کر لیں۔ مختلف سماجی اور اخلاقی مصلحتوں نے فانی کو تماشائے لب بام سے آگے بڑھنے نہ دیا لیکن آتشِ نمرود خود ان کے دل میں بھڑک رہی تھی وہ اپنی آگ میں آپ جل بجھے۔ فانی نے لکھنؤ کی رہائش ترک کر دی۔ کچھ دنوں بعد تقن جان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جب فانی اٹاوہ پہنچے تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ان کی حالت بہت غیر تھی۔ یہاں نور جہاں نے انھیں سہارا دیا۔ اور زخم پر مرہم رکھا۔ اٹاوے میں فانی کا قیام چار برس رہا۔ اس زمانے میں بھی ان کی بیوی بدایوں میں مقیم رہیں۔ نور جہاں سے فانی کے روابط زیادہ عرصے تک استوار نہ رہ سکے۔ وہ داغ ناکامی اپنے سینے میں چھپائے آگرہ روانہ ہوئے۔

فانی کے یہ ادھورے اور ناکام معاشقے ان کی داستان حیات کا ایک مستقل باب ہیں۔ فانی کے اولین عشق کے اندوہ گیں انجام کی ساری تفصیلات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ شواہد سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ بنت عم کی موت ایک ایسا سانحہ تھا جس کا داغ فانی کے دل سے کبھی نہیں دھل سکا۔ اس سانحے نے ان کی زندگی کے دستور ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ بنت عم کی موت کے بارے میں جو روایت مشہور ہے وہ بجائے خود ایک تمثیل ہے، ایک رمز ہے جس میں فانی کی ساری زندگی اور تقدیر کا عکس نظر آتا ہے۔ انھوں نے شادی کو اپنی مرضی سے ملتوی کیا تھا اور جب ساعتِ وصال قریب آئی تو کسی غیبی طاقت نے ان کی مسرتوں کا گلا گھونٹ دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فانی کی زندگی کا ہر طربیہ اس طرح نقطۂ عروج پر پہنچ کر المیہ بن جاتا ہے۔ تقن جان اور نور جہاں کے واقعات میں یہی تمثیل دوسرے طریقے سے دہرائی گئی ہے۔ ہر بار فانی کی تدبیریں مشکلوں سے دوچار رہیں اور وہ کشود کار کے لیے تقدیر کا منہ تکتے رہے۔ تقن جان سے اور پھر نور جہاں سے فانی کے روابط پر نظر ڈالیے تو فانی کے کردار میں انھی نفسیاتی عوامل کی کارفرمائی نظر آئے گی جن کا مشاہدہ اور موقعوں پر ہم کر سکتے ہیں۔ ان کی محبت میں خاص طرح کی جذباتیت ہے۔ وہ غیر مشروط طور پر خود کو محبوب کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن دوسری طرف کبھی ان کے رویے سے محبوب پر مالکانہ تصرف رکھنے کی غیر شعوری خواہش جھلکنے لگتی ہے۔ ان کا عشق بڑا ہی شائستہ تھا جس سے عورت کے تعلق سے ان کے عزت اور تحسین کے جذبات آشکارا ہوتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت ان کی زندگی میں صرف جنسی معروض بنی رہی۔ وہ اسے رفیقِ حیات نہیں بنا سکے۔ محبوب کے آگے ان کی سپردگی ایک انانیت کا پہلو لیے رہی۔ ان کی وفاداری، استواری کی شرط سے بے نیاز تھی۔ فانی کی ''زخم خوردہ نرگسیت'' گرے ہوؤں کو سہارا دینے والے شخص خدا کے تصور میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ وہ اپنے وجود ہی کو ایک عذاب اور گناہ تصور کرنے لگتے ہیں جو خود انھیں ان کی ذات سے دور کرتا ہے۔ اپنے آپ کو پانے کا وہ ایک ہی راستہ دیکھتے ہیں کہ اپنے آپ کو مٹا دیا جائے اور موت کے آرزومند ہو جاتے ہیں۔

فن کار اور ادیب عام طور پر کسی نہ کسی طرح کا عصابی خلل

(Neurosis) رکھتے ہیں۔مشہور ماہر نفسیات برگلر (Bergler) کا بیان ہے کہ بیس سالہ تحلیل نفسی کے تجربات کے دوران اس کا سابقہ بے شمار ادیبوں سے رہا۔اسے شاید ہی کوئی ادیب ایسا ملا ہو، جسے صحت مند کہا جاسکے۔ یہ انکشاف حیرت انگیز نہیں ہے۔فن کار بالعموم زود حس ہوتے ہیں اوران کی قوت متخیلہ عام آدمی سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔معمولی حادثات سے بھی ان کے غیر شعور کو فوری تحریک پہنچتی ہے اور ذہنی تلازموں کی زنجیری بن جاتی ہے لیکن ایسا زود حس فن کار عام عصابی مریضوں سے مشابہہ ہوتے ہوئے بھی ان سے کہیں مختلف ہوتا ہے۔ دونوں ماحول اور معاشرے سے تطابق پیدا کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں لیکن فن کار اپنے فن کے ذریعے کسی حد تک اس دقت پر قابو پالیتا ہے۔ایک شاعر عام انسان کی حیثیت سے بھی عصابی مریض ہوتو اگر چہ روزمرہ کی زندگی میں اس کا رویہ دوسرے عصابی مریضوں کا سا ہی ہوتا ہے لیکن وہ اپنے فن کی وجہ سے عصابی خلل کے مضر اثرات سے محفوظ ہوجاتا ہے۔فن کار کے غیر شعور میں نسلِ انسانی کا سارا ماضی چھپا رہتا ہے۔فن کار اپنے غیر شعور کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے۔ عام آدمی بڑی مہم سر کرنے کے بعد بھی اتنا تجربہ حاصل نہیں کرتا جتنا کہ شاعر کو چند معمولی واقعات سے ہوجاتا ہے۔

فانی ایک بڑے فن کار تھے۔ان کی شخصیت میں جینیئس (Genius) کی علامتیں ملتی ہیں۔عام زندگی میں ان کا شرمیلا پن ان کی خود اعتمادی کا مظہر تھا۔ وہ حد سے زیادہ حساس اور پرخلوص انسان تھے۔ان کی طبیعت میں خاص طرح کی غم گینی تھی۔ یہ غم گینی معمولی حادثوں ہی کا ردِعمل نہیں تھی بلکہ اس کی تہہ میں نوعِ انسانی کا روحانی کرب چھپا ہوا تھا۔ وہ ایک تخلیقی فن کار تھے۔ ان کی شاعری، ان کے زمانے کی آواز کا ٹیپ رکارڈ نہیں تھی۔ وہ زندگی میں شاید کوئی غایت تلاش نہیں کر سکے، لیکن ان کی زندگی کا مقصد تخلیق تھا اور انھوں نے اپنی ذہانت اور طباعی سے فن کو رنگِ دوام بخشا۔

فانی کے کردار کے جن نفسیاتی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پر فانی کی پوری شخصیت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس تجزیے سے ہمارا مقصد ان کی شخصیت پر اثر ڈالنے والے بعض غیر شعوری عوامل اور خارجی محرکات کی نشان دہی کرنا ہے۔ فنکار کی شخصیت کو اس کے تخلیقی عمل سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔فانی غزل کے شاعر تھے۔غزل کی شاعری میں شاعر کی شخصیت بظاہر بڑی غیر متعین سی معلوم ہوتی ہے لیکن شاعر کے لہجے سے اس کے ذہنی رویے اور جذباتی کیفیات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اس کے ساتھ شاعر کے تصور حیات اور کائناتی فکر سے آگاہی ضروری ہے۔ شاعروں کی شخصیت ان کے تجربوں کی صلاحیت کے ساتھ بدلتی جاتی ہے۔شخصیت جتنی بھرپور ہوگی، شاعر جتنا حساس اور باخبر ہوگا اس کا تجربہ بھی اتنا ہی وسیع اور عمیق ہوگا۔ تجربے کا اظہار غیر شخصی ہوگا، لیکن خود تجربہ اس کی ذات سے علاحدہ نہیں ہوگا۔شخصیت کے مطالعے میں یہ امور بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ شاعر ''انا'' کے ساتھ کتنی بے ریائی اور خلوص رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی ''انا'' کا بھید جاننے کی کتنی لگن رکھتا ہے۔ زبان کے استعمال کی صلاحیت بھی ہر شاعر میں یکساں نہیں ہوتی۔ شاعر کی زبان بھی اس کی شخصیت کو ناپنے کا ایک پیمانہ ہوسکتی ہے۔

فنکارانہ شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب ہم فانی کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بڑی حد تک مکمل اور منفرد شخصیت نظروں کے سامنے آتی ہے لیکن یہ شخصیت بھرپور نہیں ہے۔فانی نے جس زندگی اور کائنات کی تصویر پیش کی ہے، وہ ان کا شخصی تجربہ ہے جو شعور انسانی کے کسی تجربے سے علاحدہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ فانی کے تجربے میں گہرائی ہے لیکن وسعت نہیں ہے۔ یہیں ان کی شخصیت میں کوئی چیز چھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ غنائی شاعری میں غیر شخصی اظہار ضمیر متکلم کی تعمیم سے پیدا ہوتا ہے۔ فانی کی شاعری کا وہ حصہ اس تعمیم سے محروم ہے جہاں ان کی نظریں اپنے گریباں کے تار سے الجھ جاتی ہیں اور وہ دوسروں کے چاک داماں کو نہیں دیکھ پاتے۔ وہ ''انا'' سے بھی بددیانتی نہیں کرپاتے۔''انا'' کا بھید جاننے کی لگن بھی رکھتے ہیں لیکن جب اس راہ پر آگے بڑھتے ہیں تو ''انا'' کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ اس کے برخلاف فانی کے معاصرین میں اصغر کا کلام پڑھتے ہوئے کبھی یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہوں۔غزل گو شاعروں میں غالب کے بعد زبان کا اعجاز فانی ہی کے کلام میں ملتا ہے۔ زبان کی افادی (اظہار و ابلاغ) اور جمالیاتی قدروں میں جو توازن فانی نے پیدا کیا وہ کسی بھی شاعر کے لیے باعثِ رشک ہوسکتا ہے۔ اس معجزۂ حرف وصوت نے ان کی شخصیت کو دلکش اور باوقار بنا دیا ہے۔ فانی ایک باکمال فنکار اور باخبر شاعر تھے۔ انھوں نے نوعِ انسانی کے ذہن کو پڑھ لیا تھا اور اس کے دل کو اپنے سینے میں دھڑکتا محسوس کیا تھا۔ حیات و کائنات کے مبہم مسائل ان کی نظر میں تھے اور وہ ان کے تعلق سے فلسفے اور مذہب کی موشگافیوں اور خیال آرائیوں سے آگاہ تھے۔ فانی کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے لکیر پیٹنے کا شغل اختیار نہیں کیا۔ انھیں اپنے وجدان پر بھروسا تھا۔ غالب، اقبال اور یگانہ کی طرح ان کے لہجے میں بھی خود اعتمادی اور قطعیت ہے جس سے ان کی ترقی یافتہ شخصیت کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال کی طرح فانی بھی ایسے شاعر ہیں جن کا کلام ان کے دبے ہوئے غیر شعور ''شعوری ذہنی ارتقا'' اور ان کے ''تصورات'' کا بے لوث آئینہ ہے۔ دونوں کا کلام پڑھ کر یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ تخلیقی عمل میں جذباتی تناؤ کس قدر غالب اور شدید تھا۔ اس بات سے ان کی ''انا'' کی قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ فانی کی شاعرانہ عظمت کا راز یہی ہے کہ وہ ایک ''عظیم شخصیت'' تھے۔ ''جینیئس تھے۔

□□□

اردو خبرنامہ

تعلیم شخصیت سے فروغ کی ضامن
صدر جمہوریہ کا بھوپال میں طلبہ سے خطاب

● بھوپال۔ 29 جون، صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل نے کہا کہ تعلیم کے ذریعے ایسے شہری تیار کیے جاسکتے ہیں جو حساس بیدار فعال اور عوامی ذمے داریوں کے تئیں ایماندار ہوں۔ محترمہ پاٹل نے مدھیہ پردیش بھوج مکت یونیورسٹی کی اکیڈمک بلڈنگ کا افتتاح کرنے کے بعد طلبہ سے کہا کہ وہ سماج اور معاشرے کی اہم اکائی بنیں۔ انھوں نے کہا کہ فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعے سے سرکاری ادارے، پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر اپنے ورکرز کے لیے وقت وقت پر تربیتی پروگرام چلا سکتے ہیں۔ محترمہ پاٹل نے کہا کہ آپ نے جس محنت اور بلند ہمتی سے تعلیم حاصل کی ہے اگر اسی محنت، اور قوت ارادی سے ملک کی خدمت کریں گے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہمارا محبوب وطن ترقی کی اعلیٰ منازل طے کرے گا۔ صدر جمہوریہ نے کہا کہ اعلیٰ تعلیم کی جانب خاص طور پر دھیان دینا چاہیے۔ موجودہ دور میں زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ ملازمین کی ضرورت ہے اور اسی مقصد سے جدید تکنیک پر منحصر تعلیم کو ان تک پہنچانا بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ذمے داری ہماری یونیورسٹیاں خاص کر اوپن یونیورسٹی اچھی طرح سے نبھا سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو کالج یا یونیورسٹی میں پڑھنے نہیں جاسکتے یا جنھیں کسی وجہ سے درمیان تعلیم ہی پڑھائی چھوڑنی پڑتی ہے۔ وہ فاصلاتی تعلیمی نظام سے اپنی تعلیم مکمل کرسکتے ہیں۔ (ہمارا سماج، دہلی)

بہار میں نئی تعلیمی فکر پیدا ہو رہی ہے

● پھلواری شریف۔ 12 جون، نائب صدر جمہوریۂ ہند حامد انصاری کا امارت شرعیہ پہنچنے پر والہانہ استقبال ہوا۔ اپنی استقبالیہ تقریب میں حاظرین کو خطاب کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے کہا کہ پھلواری شریف کی مقدس سرزمین پر آنے کی تمنا تھی جو آج پوری ہوگئی۔ امارت شرعیہ کے تاریخ ساز کام سے واقفیت ہونے کے باوجود اب تک یہاں آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن جس طرح مخلص جی نے مجھے بلایا، میں انکار نہیں کرسکا۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ تمام تر مشکلوں کے باوجود بہار میں ایک فکر ابھر کر سامنے آرہی ہے، وہ نئی چیز نہیں ہے بلکہ بہت پرانی ہے۔ بہار کا تعلق علم سے ہزاروں سال پرانا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں لوگ علم اور اس کے فضائل کو بھول گئے لیکن اب بہار میں نئی فکر پیدا ہو رہی ہے۔ یہاں تعلیمی ادارے قائم ہونے لگے ہیں اور جس تیز رفتاری سے یہ ہو رہا ہے وہ حوصلہ افزا ہے۔ حامد انصاری نے مزید کہا کہ حکومت تعلیمی ادارے مہیا کراسکتی ہے، سہولتیں دے سکتی ہے لیکن بچوں کو پڑھانا مسلمانوں کا فرض ہے۔ انھوں نے خصوصی طور پر لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا اور کہا کہ جب تک مائیں نہیں پڑھیں گی، بچے نہیں پڑھ پائیں گے۔ اس سے قبل خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں مولانا سید محمد ولی رحمانی نے حامد انصاری کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ملی مسائل اور تعلیمی میدان میں حامد انصاری کی فکر بڑی مثبت ہے۔ وہ خان عبدالغفار خان سے لے کر اے پی جے عبدالکلام تک کی صحت مند روایات کو تنو مند بنانے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے

● رانچی۔ تعلیم کے میدان میں بنیادی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اقلیتوں کو اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ بات سنیچر کو ریاست کے گورنر سید سبط رضی صاحب نے مرکز ادب و سائنس کے نویں کنووکیشن (جلسۂ تقسیم اسناد) میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے کہی۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ شخصیت کی تعمیر کے ساتھ زندگی کے شعور کی نشو ونما کا وسیلہ بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے تقریباً 25 فیصدی مسلم طالب علم ہی میٹرک پاس کرتے ہیں۔ آبادی کا بڑا حصہ ہونے کے باوجود تقریباً 3 فیصد مسلم بچے ہی گریجویشن کر رہے ہیں اور صرف 4 فیصد بچے 12 ویں کے امتحان میں شامل ہو رہے ہیں۔ خواتین کی شرح خواندگی اور بھی قابل افسوس ہے۔ ایک سروے کے مطابق 101 مسلم خواتین میں صرف ایک ہی گریجویشن کی تعلیم مکمل کر پاتی ہے۔ گورنر صاحب نے کہا کہ قومی سطح پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد اوسطاً 10 فیصد ہے ہماری ریاست میں محض 6 فیصد لوگ ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ 2012 تک اسے 15 فیصد کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں فاصلاتی نظام تعلیم اور اوپن ایجوکیشن کو بڑھاوا دینا ہوگا۔ اقلیتوں کو خصوصی طور پر تعلیم کے تئیں بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سال مدرسے سے تعلیم پانے والے ایک طالب علم نے یو پی ایس سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مدرسے میں دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم

بھی دی جانی چاہیے۔ گورنر صاحب نے مرکز ادب و سائنس کو اپنے فنڈ سے ایک لاکھ روپے کی رقم دینے کا بھی اعلان کیا۔

مرکز ادب و سائنس کے سکریٹری طارق سجاد نے سکریٹری رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ مرکز 1995 میں اپنے قیام کے بعد سے اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے بچوں کو کامیابی کے ساتھ تعلیمی اور پیشہ ورانہ تربیت فراہم کررہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اگنو اور مولانا آزاد نیشنل اوپن یونیورسٹی کے کورسیز مرکز ادب و سائنس کے زیر اہتمام چلائے جارہے ہیں۔ رانچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے اے خان نے اپنی تقریر میں مرکز ادب و سائنس کی کارگزاریوں کی تعریف کی اور اس بات پر زور دیا کہ اس طرح کے کورسیز سے کمزور طبقوں کے بچوں کو زیادہ سے زیادہ مستفید کیا جانا چاہیے۔ ایوارڈ تقریب کے بعد سچر کمیٹی کی رپورٹ کے پس منظر میں اگنو اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ذریعے اقلیتوں اور کمزور طبقات کو فاصلاتی نظام تعلیم سے فائدہ پہنچانے کے موضوع پر ایک سیمینار کا بھی انعقاد کیا گیا جس کی صدارت اگنو کے پرو وائس چانسلر پروفیسر بصیر احمد خاں نے کی۔ کنووکیشن کا آغاز قاری عبداللہ کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ کامیاب طلبہ و طالبات کو گورنر سید سبط رضی، ان کے پرنسپل سکریٹری امت کھرے اور وائس چانسلر پروفیسر اے اے خان کے ہاتھوں ڈپلوما کی سندیں اور میڈل دیے گئے۔ ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایم پی سنگھ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر سارہ نسرین کے علاوہ اپولو اسپتال رانچی کے چیئرمین منظور احمد انصاری، صغیر احمد ایڈوکیٹ، فہیم حیدری، سید جمال الدین اور درجنوں دیگر معززین اس تقریب میں موجود تھے۔ (ڈاک سے)

ہریانہ اردو اکادمی کی تقریب تقسیم ایوارڈ

● ہریانہ اردو اکادمی کی تقریب تقسیم ایوارڈ کا ہریانہ نواس، چنڈی گڑھ میں اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح ڈاکٹر اے. آر. قدوائی، گورنر ہریانہ نے کیا۔ جناب مانگے رام گپتا، وزیر تعلیم ہریانہ نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ جناب راجن گپتا (آئی. اے. ایس.) کمشنر سکریٹری ہائر ایجوکیشن ہریانہ نے مہمانوں کا استقبال کیا اور جناب شورمن گوڑ (آئی. اے. ایس.) کمشنر ہائر ایجوکیشن نے ہریانہ کے ایوارڈ یافتگاں کا خیر مقدم کیا۔ گورنر صاحب نے اردو اور ہندی کے آپسی رشتے اور علاقائی زبانوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ میواتی زبان کا ادب بہت اہم ہے، اس کی اہمت کو محسوس کیا جانا چاہیے تاکہ علاقے کے لوگ اپنی زبان کے توسط سے اپنے ادبی سرمائے سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس سے قبل اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے ایوارڈز کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ جناب مانگے رام گپتا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اعزاز یافتگان کو مبارکباد پیش کی۔ اس سال اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز حالی ایوارڈ جو ایک لاکھ روپے، توصیفی سند، مومنٹو اور شال پر مشتمل ہے جو جناب حکیم اجمل خاں کو پیش کیا گیا۔

جناب رفعت سروش کو کنور مہندر سنگھ بیدی سماجی و ثقافتی ایوارڈ پیش کیا گیا جو پچیس ہزار روپے، توصیفی سند، مومنٹو اور شال پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر ساجدہ زیدی کو صابر دت ایوارڈ برائے بہبودی خواتین پیش کیا گیا۔ یہ اعزاز بھی پچیس ہزار روپے، توصیفی سند، مومنٹو اور شال پر مشتمل تھا۔ پروفیسر ستیہ پرکاش شرما تفتہ زاری کو سید مظفر حسین برنی ایوارڈ برائے شاعری، ڈاکٹر دیس راج سپرا کو خواجہ احمد عباس ایوارڈ برائے اردو نثر، محترمہ شافعہ شاد کو منشی گمانی لال ایوارڈ برائے اردو فکشن اور ڈاکٹر سویتا ملہوترہ کو سریندر پنڈت سوز ایوارڈ برائے فروغ اردو پیش کیا گیا۔ یہ انعامات بالترتیب اکیس، اکیس ہزار روپے گیارہ ہزار روپے اور پانچ ہزار روپے کے علاوہ توصیفی اسناد، مومنٹوز اور شالوں کے ساتھ پیش کیے گئے۔ اکادمی کی جانب سے ہریانہ کے قلمکاروں کو بھی اعزاز سے نوازا جاتا ہے جو اکیس سو روپے، توصیفی سند اور شال پر مشتمل ہوتا ہے مذکورہ برس کے یہ اعزازات جناب کندن اراولی اور جناب آزاد سونی پتی کو پیش کیے گئے۔

اس تقریب میں اردو کی کتابوں پر بھی اکادمی کی طرف سے انعامات دیے گئے جو سات سات ہزار روپے پر مشتمل تھے۔ برائے سال 2005-06 یہ انعام جناب آزاد سونی پتی کی کتاب ''صدا صد رنگ'' اور ڈاکٹر اے دلی بھارتی آوک کی کتاب ''قطرہ قطرہ چھاؤں'' پر دیا گیا۔ برائے سال 2006-07 یہ انعام پروفیسر آزاد گلاٹی کی کتاب ''ادراک'' جناب قمرالدین ذاکر کی کتاب ''میوات سے تبلیغی کام کی ابتدا'' اور ڈاکٹر نصیرالدین ازہر کی کتاب ''سجاد ظہیر۔ حیات و کارنامے'' پر دیا گیا۔ برائے سال 2007-08 یہ انعام جناب انجم زیدی کی کتاب ''لہو کا سفر۔ کربلا سے شام تک'' جناب مکیش انبالوی کی کتاب ''نغمۂ احساس'' جناب امیر چند بہار کی کتاب ''اردو ہے جس کا نام'' ڈاکٹر دیویندر کافر کی کتاب ''لمحہ لمحہ زندگی'' جناب ستیہ پال اشک کی کتاب ''اجالوں کی تلاش'' جناب بی ڈی کالیہ ہمدم کی کتاب ''محراب فن'' محترمہ نیتا راکیش کی کتاب ''ندی آواز دیتی ہے'' اور جناب راجندر ورما کی کتاب ''پتے ہرے پیلے'' پر دیا گیا۔ اس موقع پر ایوارڈ یافتگان کی جانب سے جناب حکیم اجمل خاں نے اظہار تشکر کیا۔ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے ایڈیٹر جناب عزیز برنی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سبھی اعزاز یافتگان کو مبارکباد پیش کی۔ اس تقریب کے دوران گورنر موصوف نے کچھ کتابوں کی رونمائی کی ان میں جناب مہندر پرتاپ چاند کی کتاب ''اردو زبان و ادب کے

فروغ میں ہریانہ کا حصہ" جناب حکیم اجمل خاں کی کتاب "مہابھارت میواتی" محترمہ روپا صبا کی شعری کتاب "روح کی منڈیر پر" اور ہریانہ اردو اکادمی کی مطبوعات "ہریانہ اردو اکادمی کے بائیس سال" اور سہ ماہی مجلہ "جمناتٹ" کا خاص نمبر شامل تھے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض جناب شمس تبریزی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

تجاویز و مطالبات: برائے فروغ اردو زبان و تعلیم

● 14 جون 2008 کو ریاست مہاراشٹر کے اہم صنعتی شہر مالیگاؤں میں ڈاکٹر محمود الرحمٰن (صدر مہاراشٹر اسٹیٹ اقلیتی کمیشن) کی آمد پر انجمن ترقی اردو مالیگاؤں کی طرف سے ان کی خدمت میں درج ذیل مطالبات پر پیش کیے گئے۔

(1) اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے فوری طور پر ایک جامع قومی پالیسی بنائی جائے اور ریاستی سرکار کو اس کا پابند بھی بنایا جائے۔

(2) ریاستی وزارت اقلیتی امور میں ایک اردو سیل قائم کیا جائے۔ جو نہ صرف اردو تنظیموں سے تال میل قائم کرے بلکہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ریاستی سرکار کو مختلف اقدامات کی ترغیب دے۔

(3) مہاراشٹر میں مرکزی اردو ٹیچرس ٹریننگ سینٹر قائم کیا جائے۔

(4) مہاراشٹر کے تمام سرکاری و نیم سرکاری دفاتر نیز ایئر پورٹ، ریلوے اسٹیشن، بینک، ڈاک خانوں، پولیس دفاتر میں ایک اردو داں آفیسر کا تقرر کیا جائے۔ درخواستیں اردو میں قبول کی جائیں اور جوابات بھی اردو زبان میں دیے جائیں۔

(5) آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم مولانا عبدالکلام آزاد کے یوم پیدائش کو یوم تعلیم قرار دیتے ہوئے سرکاری طور پر اس کا اعلان کیا جائے۔

(6) ریاستی سرکار اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر اس پر عمل آوری کو یقینی بنائے۔

(7) راجدھانی ممبئی میں اردو گھر کی تعمیر کی جائے اور مالیگاؤں میں ایک اردو ریسرچ سینٹر قائم کیا جائے۔

(8) اردو زبان کے بزرگ شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور ریٹائر اساتذہ، کو حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اور ریاستی اردو اکادمی کی جانب سے معقول وظیفہ اور بروقت طبی امداد دی جائے۔

(9) ریاستی دوردرشن، ریڈیو اسٹیشن (آکاش وانی) پر اردو کے لیے زیادہ وقت دیا جائے۔ ریاست کے تمام ضلعی آکاش وانی سینٹروں کی نشریات میں ہر روز ایک گھنٹے کا اردو پروگرام رکھا جائے۔ آکاش وانی ناسک، جلگاؤں میں اردو آفیسر کا تقرر کیا جائے۔

(10) ریاست مہاراشٹر کے اردو اخبارات خاص طور پر چھوٹے اخبارات کے لیے سرکاری اشتہارات کی فراہمی میں آسانیاں پیدا کی جائیں۔

(11) اردو اخبارات کے مدیران، نامہ نگاران اور فوٹوگرافروں کو فوری طور پر ایکری ڈیشن کارڈ دیا جائے۔

(12) اردو صحافیوں کو مہاراشٹر روڈ ٹرانسپورٹ سروس کے ساتھ ہی ریلوے میں بھی مفت سفری سہولت فراہم کی جائے۔

(13) مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کے سالانہ بجٹ میں اضافہ کرتے ہوئے اردو ماہنامہ امکان اور بچوں کا ایک ماہنامہ جاری کیا جائے۔ ادب اطفال کے قلمکاروں کو خصوصی انعامات سے سرفراز کیا جائے۔

(14) اردو ادبی انجمنوں، لائبریریوں میں مفت اردو کمپیوٹر کلاس جاری کی جائے جس کے لیے ریاستی سرکار فنڈ مہیا کرے۔

(15) نصاب میں آرٹ سبجیکٹ کے طور پر اردو خطاطی، کمپیوٹر خوشنویسی، کمپیوٹر کی تعلیم کو لازمی طور پر شامل کیا جائے۔ (ڈاک سے)

کلیم عاجز بہار اردو مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین نامزد

● پٹنہ۔ 18 جون، ریاستی حکومت نے ممتاز شاعر پدم شری ڈاکٹر کلیم عاجز کی صدارت میں ریاست کی دوسری سرکاری زبان اردو کی ترویج و اشاعت میں مشورہ دینے کے لیے باضابطہ طور پر نئی اردو مشاورتی کمیٹی تشکیل دے دی ہے۔ آج حکومت کی جانب سے جاری کیے گئے نوٹیفکیشن میں یہ اطلاع دی گئی ہے۔ اطلاع کے مطابق اس کمیٹی کی مدت کار تشکیل کی تاریخ سے تین برسوں کی ہوگی۔ لیکن اگر حکومت چاہے تو اس کی مدت کار میں توسیع بھی کرسکتی ہے۔ کمیٹی میں جن لوگوں کو شامل کیا گیا ہے ان میں پروفیسر کلیم عاجز صدر کے علاوہ اردو کے مشہور صحافی ڈاکٹر رضوان احمد کو نائب صدر کا عہدہ دیا گیا ہے۔ کمیٹی میں جن افراد کو بطور ممبر شامل کیا گیا ہے، ان میں خانقاہ منعمیہ کے سجادہ نشین سید شاہ شمیم منعمی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، ایچ ڈی جین کالج آرہ میں اردو اور فارسی کے استاد محمد رضوان اللہ آروی، گیا کے پروفیسر محمد مسیح الدین احمد ضیا منصوری، پروفیسر تسلیم بلخی، پروفیسر رضی الدین نظامی، آر کے کالج مدھوبنی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر بدیع الزماں، پروفیسر جمیل اختر، مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سٹی کے مدرس مولانا امانت حسین، صحافی محمد علی ظفر، صحافی محمد ریحان خان اور کیبنٹ سکریٹریٹ (راج بھاشا) کے ڈائرکٹر شامل ہیں۔ کمیٹی کے چیئرمین کو وزیر کے مساوی عہدہ دیا گیا ہے

جبکہ نائب صدر اور ممبران کو دی جانے والی مراعات کے سلسلے میں محکمۂ مالیات سے مشورہ کر کے علیحدہ حکم جاری کیا جائے گا۔ اعلانیہ کے مطابق کمیٹی کا صدر دفتر اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ میں ہوگا۔ گورنر کے حکم سے حکومت کے پرنسپل سکریٹری گریش شنکر کے دستخط سے جاری نوٹیفکیشن کے مطابق مذکورہ کمیٹی میں دو ممبران کی جگہ خالی ہے۔ فی الحال چیئرمین سمیت 15 نفری کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس میں اردو ڈائرکٹر بھی شامل ہیں۔ اس سے قبل کی حکومت نے ایک کمیٹی بنائی تھی جس کا چیئرمین بھی ڈاکٹر پروفیسر کلیم عاجز کو مقرر کیا گیا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر انھوں نے اس ذمے داری سے معذرت کر لی تھی لیکن اردو کی خدمات اور ان کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر حکومت نے انھیں وزیر کا درجہ دیتے ہوئے مشاورتی کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا جسے انھوں نے قبول کر لیا ہے۔ اردو اکادمی کے سکریٹری مسٹر شہزاد انصاری نے اردو مشاورتی کمیٹی کی تشکیل نو کو موجودہ نتیش حکومت کا ایک تاریخ ساز قدم بتاتے ہوئے چیئرمین سمیت جملہ اراکین کو مبارکباد دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جب اردو مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین کو وزیر کا درجہ دیا گیا ہے اور وائس چیئرمین اور ممبران کو خصوصی مراعات دینے کی بھی بات چیت چل رہی ہے۔ دوسری طرف ریاستی 15 نکاتی پروگرام کمیٹی کے کارگزار چیئرمین محمد شریف قریشی نے بہار اردو مشاورتی کمیٹی کی تشکیل نو پر ریاست کے وزیر اعلیٰ نتیش کمار کو مبارکباد دی ہے اور کہا کہ انھوں نے بہار کے مسلمانوں اور اردو کی بقا کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کا ماہانہ ادبی اجلاس

● گلبرگہ۔ انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کا ماہانہ ادبی اجلاس 15 جون 2008 بروز اتوار بوقت ساڑھے گیارہ بجے منعقد ہوا۔ اجلاس کا آغاز سید علیم اللہ حسینی لکچرر (بیجاپور) کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ خواجہ پاشاہ انعامدار (معتمد انجمن) اور امجد جاوید (کنوینر ادبی مجلس) کے ابتدائیے کے بعد صدر انجمن جناب ولی احمد نے ادیبوں شاعروں اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر وحید انجم (شریک معتمد) نے اجلاس میں حصہ لینے والے فنکاروں کا تفصیلی تعارف کروایا۔

جناب ناظم خلیلی (رائچور) نے ایک افسانہ بعنوان ''یہ تار تار تصور یہ تار تار خیال'' پیش کیا۔ جناب امجد جاوید نے اس افسانے کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ افسانے کا ماحول پُراسرار ہے جس میں درخت کو استعارہ بنا کر انسانی ارتقا کو پیش کیا گیا ہے۔ مصنف اپنے آپ کو درخت کی جڑوں میں تلاش کرتا ہے۔ مبصر نے افسانہ نویس کو زوائد سے اجتناب برتنے کی تلقین کرتے ہوئے پیش کردہ افسانے کو بہترین فن پارہ قرار دیا۔ افسانے کے بعد ڈاکٹر واجد اختر صدیقی نے اپنی پانچ منتخبہ غزلیں تبصرے کے لیے پیش کیں، ان پر ڈاکٹر وحید انجم نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ واجد اختر صدیقی کو ہنوز مشق کی ضرورت ہے۔ وہ مستقبل میں عمدہ شاعری کا نمونہ پیش کریں گے۔ بعد ازاں جناب سعید عارف نے اپنی منتخبہ پانچ غزلیں پیش کیں۔ ڈاکٹر جلیل تنویر نے غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ سعید عارف اصلاحی ذہن کے مالک ہیں انھوں نے اپنی شاعری سے اصلاح معاشرہ کا کام لیا ہے۔ شاعر نے سیاسی قومی اور وطنی جذبات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (جنوبی ہند) کے مشیر جناب علی ظہیر (حیدرآباد) بھی شریکِ محفل تھے۔ انھوں نے ادبی محفل کی کارروائیوں اور شرکا کی قابلِ لحاظ تعداد پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ افسانہ اور کلام پر تبصرے مناسب تھے، سامعین کو بھی اس گفتگو میں شامل ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے حالیہ دورۂ ترکی کے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ بظاہر ترکی پر مغرب کا اثر نظر آتا ہے لیکن عوام کا غالب رجحان مذہب کی طرف ہے۔ ترکی چاہتا ہے کہ یوروپی یونین میں شامل ہو کر بھی اپنا تشخص برقرار رکھے۔

اس موقع پر نمائندہ منصف اور انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے حیاتی رکن ڈاکٹر ماجد داغی کو کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے ان کی نثری خدمات پر ایوارڈ دیے جانے کی مسرت میں انجمن کی جانب سے صدر اجلاس نے انھیں شال اوڑھایا۔ جناب ایم۔اے۔ عظیم سابق صدر انجمن نے اپنی جانب سے مومنٹو پیش کیا۔ ڈاکٹر ماجد داغی نے احبابِ انجمن سے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ اس ایوارڈ اور تہنیت نے انھیں اپنی ذمے داریوں کا احساس دلایا ہے۔

صدر اجلاس جناب وہاب عندلیب نے اظہار خیال کرتے ہوئے ادبی محفل کے کامیاب اختتام پر کنوینر اور احبابِ انجمن کو مبارکباد دی اور کہا کہ جہاں ادبی اجلاس کا وقت مقرر ہوتا ہے وہیں مبصرین اور گفتگو میں حصہ لینے والوں کے بھی وقت کا تعین ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ خاص طور پر نئے لکھنے والوں کو ادبی اجلاس میں شریک ہو کر اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ آخر میں جناب محمد مجیب احمد (رکن عاملہ) نے اظہار تشکر فرمایا۔
(ڈاک سے)

یادِ رفتگاں

● لکھنؤ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر عبدالعلیم نے 1936 میں لکھنؤ میں ہوئی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں شرکت کی تھی، اور وہیں سے وہ کمیونسٹ تحریک میں شامل ہوئے۔ 1938 میں اس

ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی ہوئے۔ اس وقت برطانی افسروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ترقی پسند مصنفین میں شامل دانشوروں سے ملاقات کریں اور انھیں اس تحریک سے روکنے کی کوشش کریں۔ کیوں کہ اس تحریک کے دو مقاصد تھے ایک ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرنے کی جدوجہد میں شامل ہونا اور دوسرا مظلوموں کے حق کی آواز بلند کرنا۔ جس میں پروفیسر عبدالعلیم آگے آگے تھے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز مورخ پروفیسر عرفان حبیب نے کیا۔

پروفیسر عبدالعلیم کی پیدائش کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ہندی سنستھان میں ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے عرفان حبیب نے بتایا کہ 1941 میں وہ گرفتار ہوئے اور لکھنؤ اور آگرہ جیل میں قید رہے جہاں ان کی ملاقات جواہر لعل نہرو سے ہوئی۔ انھوں نے 1954 میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے دور میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈی قائم کرایا۔ تا کہ اسلام کی تعلیم سائنسی بنیاد پر دی جائے۔ عرفان حبیب نے مرحوم کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے پوری کمیونسٹ تحریک میں باوجود کم گوئی کے ان کے جیسا اچھا مقرر نہیں دیکھا۔ پروفیسر عبدالعلیم میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام ہونے والے سیمینار میں جھارکھنڈ کے گورنر سید سبط رضی، آئی اے ایس انیس انصاری، بیگم حامدہ حبیب اللہ، ڈاکٹر ارتضی کریم، راکیش کمار اور عابد سہیل وغیرہ نے ڈاکٹر عبدالعلیم کی علمی، ادبی، سیاسی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقع پر پروفیسر عبدالعلیم کی خدمات پر مبنی ایک کتاب کی گورنر جھارکھنڈ سید سبط رضی، عرفان حبیب و عابد سہیل کے ہاتھوں رسم اجرا بھی ہوئی۔

● لکھنؤ۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی پیدائش کی صدی تقریبات کے سلسلے میں دانش محل میں مرحوم کی تصویر آویزاں کی گئی۔ یاد رہے کہ لکھنؤ میں اپنے تیرہ سالہ قیام کے دوران ڈاکٹر علیم اکثر و بیشتر دانش محل تشریف لاتے تھے اور دانش محل کی علمی نشستوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر علیم مرحوم کی بیٹی جمیلہ ماجد صدیقی نے ڈاکٹر علیم کی تصویر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے دانش محل میں اس کو آویزاں کرنے کے فیصلے پر مسرت کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں شہر کی ممتاز شخصیتوں نے حصہ لیا۔ پروفیسر شاہ عبدالسلام نے ڈاکٹر علیم کی اسلامی علوم اور عربی ادب کے میدان میں نمایاں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی اور ان کے افکار و خیالات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مغربی دنیا سے اٹھنے والے اسلام مخالف سوالات اور الزامات کے جوابات معقولات اور دلائل کے ساتھ جس طرح ڈاکٹر علیم نے پیش کیے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالعلیم کی کتاب ''سیرت نبویؐ اور مستشرقین'' کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے مرحوم کے تبحر علمی کا اعتراف کیا اور اسلامی علوم کے میدان میں ان کی ان تحریروں سے جو فائدہ پہنچا اس کا تفصیل سے ذکر کیا۔

مسٹر عابد سہیل نے ترقی پسند تحریک سے مرحوم کا تعلق، ان کے نظریات اور ان کے افکار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر علیم ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے۔ ان کی بعض تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ انھوں نے بر بنائے فراخ دلی اپنی بعض تحریروں کو دوسروں کے نام سے شائع ہونے کی اجازت دی۔ عابد سہیل نے بتایا کہ ان کی بہت سی تحریریں ابھی بھی طاق نسیاں میں ہیں جن کو وہ بہت جلد ترتیب و تدوین کے ساتھ منظر پر لا رہے ہیں۔ پروفیسر مولانا شمس تبریز اور مولانا عبدالمتین فرنگی محلی نے بھی اظہار خیال کیا۔ ان کی بیٹی جمیلہ ساجد صدیقی نے اپنے والد کے حوالے سے اپنے بچپن کی یادداشتوں پر مبنی ایک مختصر تقریر میں ان کی روزمرہ کی زندگی اور افراد خانہ کے ساتھ شفقت و محبت کے واقعات کا ذکر کیا۔ ان کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور انھیں ملحد تک کہا گیا۔ حالانکہ وہ اپنی زندگی میں ایک راسخ العقیدہ اور سچے مسلمان تھے۔ آخر میں دانش محل کے مالک محمد نسیم کے صاحبزادے محمد نعیم احمد نے مہمان خصوصی جمیلہ صدیقی اور تمام حاضرین جلسہ کا دانش محل کی اس ادبی تقریب میں شرکت کے لیے شکریہ ادا کیا۔

● یکم جون کی سہ پہر میں مراٹھی کے مایہ ناز ڈرامہ نویس کہانی کار صحافی اور سوشل ایکٹیوسٹ وجے تنڈولکر کی یاد میں اعتراف گروپ ممبئی کی جانب سے میرا روڈ میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ ناسک سے تشریف لائے ہوئے سینئر شاعر آدم باوا نے نشست کی صدارت کی اور کہا کہ ''وجے تنڈولکر نہ صرف ایک اچھے فنکار تھے بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ اپنی دھن میں چلنے والے شخص تھے۔ اپنی بات خود اعتمادی کے ساتھ رکھنے کے فن سے بھی واقف تھے۔ ادیب کے روپ میں ان کی روشنی ہمیشہ قائم رہے گی۔''

ممتاز افسانہ نگار سلام بن رزاق نے وجے تنڈولکر کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وجے تنڈولکر ہمیشہ نوجوانوں کو قریب رکھتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے سب سے پہلے نوجوانوں سے ملتے۔ ان کے مسائل سنتے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے جبکہ اردو قلمکاروں میں اس خوبی کا فقدان ہے۔ اردو کے بیشتر اہم قلمکار نوجوانوں سے ایک فاصلہ بنائے رکھتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وجے تنڈولکر اپنا ذہن کھلا رکھتے تھے اور دوسروں کی مخالفت کو بھی برداشت کرنے کا ان میں حوصلہ تھا۔

مشہور شاعر یعقوب راہی نے کہا کہ وہ نہایت کم گو انسان تھے۔ جبکہ ہمارے اردو معاشرے میں جوں جوں ادیب کا قد بڑھتا جاتا ہے، اس کی

لٹریچر انوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وجے تنڈلکر نہ صرف جنریشن گیپ کے مخالف تھے بلکہ ہمہ وقت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تیار رہتے تھے۔ افسانہ نگار اور صحافی ساجد رشید نے کہا کہ ہم لوگ وجے تنڈلکر کو ایک ادیب، ڈرامہ نگار، صحافی، اور کہانی کار کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک سرگرم ایکٹیوسٹ بھی تھے، ذات سے وہ برہمن تھے مگر برہمنوں نے ان پر برہمن مخالف ہونے کا الزام اس وقت لگایا جب ان کا ڈرامہ ''گھاشی رام کوتوال'' پیش کیا گیا۔ اسی طرح ''کنیادان'' ڈرامہ لکھنے کے بعد دلتوں نے، دلت مخالفت کا الزام لگایا۔ مگر وجے تنڈلکر کے لیے سچ کی دریافت ہی ان کا فنکارانہ منصب رہا۔

وقار قادری نے دوران نظامت وجے تنڈلکر سے اپنی دو ملاقاتوں کو اپنی خوش نصیبی گردانتے ہوئے کہا کہ وجے تنڈلکر کو صاف گوئی بہت پسند تھی، وجے تنڈلکر نے ڈرامہ، کہانی اور صحافتی کالم لکھے مگر ان کے یہاں ہر صنف اپنا روپ خود لے کر پیدا ہونے کی بات آنجہانی نے ایک انٹرویو میں کہی ہے۔ رحمان عباس نے کہا کہ وجے تنڈلکر کی شخصیت میں شروع ہی سے ایک باغی انسان اور ایک بڑا تخلیقی فنکار موجود تھا۔ اس موقع پر ڈرامہ نگار اسلم پرویز نے کہا کہ وجے تنڈلکر کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو میرے خیال میں وہ ایک لفظ بغاوت ہوگا، مشہور سماجی کارکن پولوک چکرورتی نے مراٹھی اور بنگالی تھیٹر کے حوالے سے وجے تنڈلکر کے مقام کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

نشست میں خالد شاہین، فرحان حنیف، یعقوب ساغر، مختار خان، سکندر مرزا، عبداللہ امتیاز احمد اور دیگر سامعین شریک تھے۔ اختتام پر تمام شرکا نے دو منٹ خاموش کھڑے رہ کر آنجہانی وجے تنڈلکر کو شردھانجلی پیش کی۔

مختصرات

● نئی دہلی۔ 12 جون، وزارت تعلیم کے سابق ڈائرکٹر جناب کے.کے کھلر نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ شمالی ہند کی ریاستوں نے سہ لسانی فارمولے پر عمل نہیں کیا اور اردو کو جان بوجھ کر نظرانداز کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ 1961 میں وزیراعظم جواہر لال نہرو کی طلب کردہ وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس میں سہ لسانی فارمولہ پر اتفاق رائے ہوا تھا جس کے تحت ہر ریاست میں پرائمری اور ثانوی سطح پر بچوں کو سرکاری زبان ہندی، بین الاقوامی زبان انگریزی اور ایک جدید ہندوستانی زبان ترجیحاً جنوبی ہند کی زبان پڑھائی جانی تھی۔ ہندی اور انگریزی تو پڑھائی گئی لیکن جدید ہندوستانی زبان کی جگہ کلاسیکی زبان سنسکرت پڑھائی جارہی ہے جو سراسر غلط ہے۔ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہے اور اس کو کسی خاص مذہب یا خطے تک محدود نہیں کیا جانا چاہیے۔ جناب کے کے کھلر نے بتایا کہ جب وہ وزارت تعلیم میں تھے تو ہریانہ کے دورے کے دوران انھیں بتایا گیا کہ ریاست میں تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھائی جارہی ہے لیکن موقع پر جاکر پتہ چلا کہ ریاستی حکومت کا یہ دعویٰ جھوٹا تھا اور ریاست ہریانہ میں اردو کا نہ کوئی طالب علم ہے نہ استاد۔ انھوں نے ریاستی حکومتوں کو مشورہ دیا کہ وہ سہ لسانی فارمولے پر نیک نیتی سے عمل کریں اور اردو کو اپنے تعلیمی نصاب میں اس کا صحیح مقام دیں۔ اس سے ملک میں قومی و لسانی یکجہتی کو بھی فروغ ملے گا۔ سہ لسانی فارمولہ ایک ایسی طے شدہ پالیسی ہے جس پر قومی سطح پر اتفاق رائے بن چکا تھا۔ اس پر عمل نہ کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ (صحافت، دہلی)

● بھوپال۔ 21 جون، مدھیہ پردیش کے وزیراعلیٰ شیوراج سنگھ چوہان نے آج ہندی کے ممتاز صحافی ہری دنش کو ان کی مجموعی صحافتی خدمات پر مادھوراو سپرے ایوارڈ دیا۔ مسٹر ہری دنش ہندی اخبار ''پربھات خبر'' کے ایڈیٹر ہیں۔ اس موقع پر مشہور گاندھیائی فلاسفر ایس.این. سہارا اور اردو کے افسانہ نگار اقبال مجید سمیت 11 افراد کو رجت پروسان دیے گئے۔ یہ ایوارڈ 21 ہزار روپے، ایک شال اور توصیفی سند پر مشتمل ہیں۔ یہ ایوارڈ مادھوراؤ سپرے میموریل نیوز پیپر میوزیم اینڈ ریسرچ کی سلور جوبلی کے موقع پر دیے گئے ہیں۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● مراد آباد۔ 4 جولائی، اشفاق وبسمل سوسائٹی کی جانب سے ایک میٹنگ کرکے حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ معلم اردو بے روزگاروں کو بارہ سال سے بیسک اسکولوں میں تقرریاں نہیں ملی ہیں ان کو بحال کیا جائے۔ سوسائٹی کے صدر راحت زماں خاں نے اس موقع پر کہا کہ یوپی گورنمنٹ 12 سال سے معلم اردو بے روزگاروں کو معلق رکھے ہوئے ہے۔ آج سے بارہ سال قبل اس وقت کی سرکار نے معلم اردو کی سند کو بی ٹی سی کے مساوی تسلیم کرکے 1995-96 میں بارہ ہزار تقرریاں کی تھیں تب سے آج تک اردو اساتذہ کی کسی بھی بیسک اسکول میں تقرری نہیں کی گئی ہے۔ موجودہ سرکار نے اقتدار میں آنے سے پہلے معلم اردو بے روزگاروں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہماری سرکار بنی تو ہم معلم اردو بے روزگاروں کو صوبے کے بیسک اسکولوں میں اردو پڑھانے کی تقرریاں دیں گے۔ آج سرکار بن جانے کے تقریباً سوا سال بعد بھی سرکار نے تقرری کا عمل شروع نہیں کیا ہے۔ سوسائٹی مطالبہ کرتی ہے کہ معلم اردو سند یافتگان کو سال رواں میں سیشن شروع ہونے پر تقرریوں کا عمل شروع کردینا چاہیے۔ جس سے اردو کی ترقی و ترویج کا راستہ صاف ہوسکے۔ بے روزگاروں کو روزگار فراہم ہوجائے۔ جب تک اقلیتوں کو سرکاری ملازمتوں میں مناسب روزگار مہیا نہیں کرایا جاتا تو سرکار کا دیا ہوا یہ نعرہ بے معنی ثابت ہوگا۔ عبدالمنان انصاری، دلشاد حسین، جاوید زماں خاں، محمد شریف خاں، شفیق

خاں، محمد کمال، طاہر ادریسی اور شاہد ساگر وغیرہ نے میٹنگ میں شرکت کی۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● کٹھور۔ 10 جون، قصبہ کٹھور کے پرائمری اسکول نمبر 2 میں طرف داران اردو اور محبان اردو کی جانب سے میٹنگ منعقد کر کے وزیر اعلیٰ مایاوتی کے نام ایک میمورنڈم بھیجا گیا۔ میٹنگ کی صدارت محمد عابد سوال خاص نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض مزاج حسن نے انجام دیے۔ میٹنگ میں اسرار الحق اسرار سکریٹری اردو رابطہ کمیٹی اتر پردیش نے مایاوتی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں ہزاروں سال سے بدترین حالت دلتوں کی رہی ہے۔ ٹھیک انھی حالات سے آزادی وطن کے بعد اردو زبان بھی گزر رہی ہے لیکن اب کچھ توقع اتر پردیش سرکار بالخصوص مایاوتی سے ہے۔ ان کو چاہیے کہ جس طرح سے انھوں نے اپنی محنت اور حوصلوں سے صوبے کی تمام پسماندہ برادریوں کو ان کے جائز حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کی ہے اسی طرح اردو زبان کو بھی اس کا حق دلوائیں۔

میمورنڈم ریاستی حکومت کے وزرا نسیم الدین صدیقی، دھرم سنگھ سینی اور بابو منقاد علی (ایم پی راجیہ سبھا) کو بھی بھیجا گیا شرکا میں سابق چیئرمین شمس پرویز، معزول چیئرمین مطلوب گوڑ، چودھری مشکور احمد، ماسٹر لقمان، محمد ظفر، منشی آس محمد اور حماد ایڈوکیٹ وغیرہ تھے۔

میٹنگ میں دسمبر 1996 سے قبل پاس معلم اردو بے روزگاروں کو تقرری میں اولیت، ہر محکمہ میں اردو مترجمین کی تقرری اور ٹی ایل ایف میں اردو زبان کو لازمی قرار دیے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● فیض آباد۔ 24 جون، بھید بھاؤ اور امتیاز برتنے والی پالیسی پر اتر پردیش میں کام ہو رہا ہے۔ اس کے تحت اردو کے ساتھ بھی جانبداری سے کام لیا جا رہا ہے۔ گزشتہ 14 برسوں سے اردو ٹیچروں کی بھرتی نہ ہونے سے بہت ہی کم اسکولوں میں اردو کی تعلیم ہو پا رہی ہے۔ یہ باتیں اردو بچاؤ تحریک کے ریاستی جنرل سکریٹری ارشاد احمد نے ایک بیان میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ جو زبان ہماری تہذیب میں شامل ہے اس سے ہم کو دور کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے محبان اردو کے رویے پر بھی افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اردو کی خراب صورت حال کا رونا رو کر رہ جاتے ہیں، کسی ایک ایجنڈے پر متحد اور متفق ہو کر حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے آگے نہیں آتے۔ انھوں نے کہا کہ اگر سبھی محبان اردو یہ طے کر لیں کہ اردو کو کم از کم درجہ آٹھ تک لازمی کرواتا ہے تو یہ کام کوئی مشکل نہیں کیونکہ اس وقت اسمبلی میں جب اردو کو آٹھویں درجہ تک لازمی کرنے کا بل پیش ہو تو بے جے پی کے علاوہ کوئی مخالفت نہیں کرے گا بس ضرورت ہے کسی ایک ایم ایل اے یا ایم ایل سی کو اسمبلی میں یہ تجویز پیش کرنے کی اور جب تک یہ نہیں ہوگا تب تک اردو کی حالت بدستور خراب ہوتی جائے گی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● اردو کے مخالفین بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ اردو کی چاشنی اور کہیں نظر نہیں آتی۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو کی جڑیں ملک کے عوام کی رگ و پے میں پیوست ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر ڈاکٹر راحت اندوری نے کیا۔ وہ یہاں شمس آباد میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے آئے تھے۔ راشٹریہ سہارا سے ایک خصوصی گفتگو میں ڈاکٹر راحت اندوری نے کہا کہ مشاعرے ہماری تہذیب وتمدن کا آئینہ ہیں لیکن اب کچھ لوگوں نے مشاعرے کو پیشہ ورانہ رخ دے دیا ہے جس سے اردو ادب کا فروغ کم نقصان زیادہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بازار جہاں جاتا ہے معیار گھٹ جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشاعروں سے زبان کی ترقی ہوئی ہے۔ ملک کے کئی اہم حصوں میں اردو کی آبیاری ہوئی ہے۔ جو زبان عوام کو پسند آئے گی وہ معاشرے میں ہزاروں رخنہ اندازیوں کے باوجود ترقی کرے گی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کو ہندوستان کی ہر ریاست میں قدر کی نگاہ سے دیکھا اور بولا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک اردو کے چاہنے والے رہیں گے اور مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہے گا اردو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 24 جون، انڈیا رفاہ عام فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام گزشتہ کئی ماہ سے جاری تحریری انعامی مقابلے میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو غالب اکادمی میں ممتاز عالم دین مولانا اسرار الحق قاسمی، خواجہ حسن ثانی نظامی، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر نظام الدین اولیا ڈاکٹر نعمان خاں اور جامعہ ہمدرد کے غلام یحییٰ انجم کے ہاتھوں انعامات سے نوازا گیا۔ رفاہ عام فاؤنڈیشن کے تحت منعقدہ تحریری مقابلے میں پہلی پوزیشن دارالعلوم دیوبند کے متعلم اشتیاق احمد نے حاصل کی جنھیں 1500 روپئے، ایک شیلڈ اور توصیفی سند دی گئی، دوسری پوزیشن بھی دارالعلوم دیوبندی کے ایک اور طالب علم اقبال قمر نے حاصل کی جنھیں 1000 روپئے شیلڈ اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔ تیسرا انعام دارالعلوم للبنات مرزا پور ضلع سہارنپور کی طالبہ سیدہ غفرانہ کو دیا گیا جنھوں نے مقابلے میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ انھیں 500 روپئے، ایک شیلڈ اور توصیفی سند دی گئی۔ چوتھا انعام دارالعلوم دیوبند (وقف) کے متعلم محمد رفیق کو حاصل ہوا، انھیں ایک شیلڈ، ایک کتاب ''اصحاف کہف کے غار کا انکشاف'' اور توصیفی سند دی گئی۔ پانچویں پوزیشن پر منڈاولی فضل پور دہلی کی ناظرین سیفی اور نرگس سیفی رہیں۔ جنھیں خواجہ حسن نظامی ثانی کے ہاتھوں ایک ایک شیلڈ، ایک ایک کتاب ''اصحاف کہف کے غار کا انکشاف'' اور ایک ایک توصیفی سند سے نوازا گیا۔ چھٹا انعام فرحین خانم منڈاولی فضل پور دہلی کو دیا گیا۔ جنھیں ایک شیلڈ، کتاب اور توصیفی سند دی گئی۔ مولانا اسرار الحق قاسمی نے

انعامات حاصل کرنے والے تمام طلبہ وطالبات کو مبارکباد پیش کی اور رفاہ عام فاؤنڈیشن کے ذریعے کیے گئے تحریری انعامی مقابلے کو سراہتے ہوئے کہا کہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے جو مقابلہ رفاہ عام فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد ہوا اور جو انعامات طلبہ وطالبات کو دیے گئے، اس کے لیے آل انڈیا رفاہ عام فاؤنڈیشن او راس کے صدر قاری محمد فیضان جامعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے پروگرام نئی نسل کی حوصلہ افزائی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے بھی انعامات کی تقسیم پر خوشی کا اظہار کیا اور مقابلے میں حصہ لینے والے تمام طلبہ وطالبات کو سراہا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

● سیتاپور۔ مشہور شاعر وصحافی جناب مست حفیظ رحمانی کو ایک پروقار تقریب میں مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ ان کی مختلف شعبہ جات میں انجام دی گئی خدمات کے لیے دیا گیا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے انھیں یہ ایوارڈ پیش کیا۔ اس موقع پر یوپی ودھان پریشد کے اپوزیشن لیڈر جناب احمد حسن، شہر سیتاپور سے ایم ایل اے۔ جناب رادھے شیام جائسوال، سابق ضلع پنچایت صدر مہندر سنگھ ورما، یوپی خواتین کمیشن کی صابق صدر رنجنا واجپئی، سابق وزیر بنیاد حسین انصاری، کے علاوہ شعر وادبا کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ملک زادہ منظور احمد نے مست حفیظ رحمانی کی ادبی، لسانی وسماجی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مست صاحب وہ حوصلہ مند انسان ہیں جو نامناسب حالات میں بھی بڑی رجائیت کے ساتھ کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان اور اردو ادب کے حوالے سے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا اعتراف واحترام کرنا ہمارا فرض ہے۔ تقریب کے ناظم اور بزم اردو سیتاپور کے سکریٹری جناب رضوان خان نے کہا کہ مست صاحب اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں۔ جناب اشتیاق علی صبا نے جناب مست حفیظ رحمانی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس عمر میں بھی مست صاحب نوجوانوں سے زیادہ سماجی وادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس تقریب کے بعد ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، شاعر جمالی، واصف فاروقی، جمیل خیرآبادی، عمر فاروقی، حامد بہرائچی، مست حفیظ رحمانی، رضوان خان، اشتیاق علی صبا، خورشید حیدر، ہاشم فیروز آبادی، کفیل بسوانی اور دیگر شاعروں نے کلام پیش کیا پروگرام کنوینر محمد عمران آصفی نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● مرادآباد۔ 14 جون 2008 کو برائٹ پبلک اسکول کی جانب سے یوم افسانہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام میں گورکھپور سے تشریف لائے ڈاکٹر عبیداللہ چودھری نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت فرمائی۔ پروگرام کی صدارت بدایوں سے تشریف لائے سہ ماہی ''لمحے لمحے'' بدایوں کے نائب مدیر خان فہیم نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شکیل انوار صدیقی نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت ذاکر فیضی نے بحسن وخوبی انجام دی۔ جن حضرات نے اپنے افسانے پیش کیے، ان کے نام ہیں: ڈاکٹر عبیداللہ چودھری، شکیل انوار صدیقی، ذاکر فیضی، جاوید رشیدی، ارشد اقبال، عرفان فہیم، شبنم راہی، اسلام عرشی، اویس شمسی۔

پروگرام کے اختتام پر برائٹ پبلک اسکول کی پرنسپل ناہید مکی نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے اس طرح کے پروگرام ہوتے رہنے چاہئیں۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 22 جون، اردو پریس کلب کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد پروگرام ''شام غزل'' میں معروف غزل سرا نعیم علی نے اپنے فن سے شائقین کو مسحور کردیا۔ شام غزل میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی سرکردہ شخصیات بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ جن میں مرکزی وزیر برائے ڈبہ بند خوراک سبودھ کانت سہائے، مرکزی وزیر مملکت برائے کوئلہ اور معدنیات سنتوش برگوڈیا سابق، گورنر ادم پرکاش کوہلی، سابق الیکشن کمشنر جی وی جی کرشنا مورتی، ایڈیشنل کمشنر پولیس کیول سنگھ اور معروف گلوکار یمن خاں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ شام غزل کے مہمان خصوصی دہلی سرکار کے محکمہ ٹرانسپورٹ کے ڈپٹی کمشنر منصور احمد عثمانی تھے۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر مولا بخش نے اردو پریس کلب کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ شام غزل کی نظامت کرتے ہوئے معین شاداب نے اردو غزل اور زبان وادب کے فروغ میں غزل سرائی کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ قابل ذکر ہے کہ نعیم علی کا تعلق اترپردیش کے مرادآباد گھرانے سے ہے اور غزل گائیکی کا فن انھیں اپنے والد نبی جان خاں سے ورثے میں ملا۔ بعد میں نعیم علی نے استاد افضل حسین نگینوی کی تربیت میں اپنے فن کو جلا بخشی۔ 1980 میں وہ ممتاز غزل سنگر استاد غلام علی کی شاگردی میں آئے۔ نعیم علی کو سنگت دینے والوں میں طبلہ پر ارشد خاں، کی بورڈ پر امرت خاں، سارنگی پر غلام علی موجود تھے۔ اس موقع پر نعیم علی کے فرزند فراز علی اور سیف علی بھی موجود تھے۔ کیول سنگھ نے اظہار تشکر کیا۔ محفل کے دیگر شرکا میں پاکستان ہائی کمیشن کے فرسٹ سکریٹری ذوالفقار احمد، پی آئی بی کے ڈائرکٹر ایس ایم خاں، ڈپٹی ڈائرکٹر دوردرشن برکت علی، معروف شاعر فرحت شہزاد، حاجی محمد ادریس انصاری، پیغام آفاقی، انجم عثمانی، ساجد حسین ایڈوکیٹ، سید ظفر محمود، نوید خاں، فصیح اکمل، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، ایم سلیم، مشتاق احمد ایڈووکیٹ، سویتا ایم، نسرین طارق، ڈاکٹر کمل بیتائی، انوار انجم، اشفاق احمد عارفی، عبدالرحمن، فرید چغتائی، حنیف ترین کے اسماء شامل ہیں۔ نعیم علی نے اپنے استاد غلام علی کی کمپوزیشن کے علاوہ اپنی کمپوز کی ہوئی کئی غزلیں پیش کیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● دیوبند۔ 18 جون، انٹرنیشنل قلم فاؤنڈیشن آف انڈیا کی جانب سے

''ایک شام بھارت۔ پاک دوستی کے نام'' سے پاکستان کی شاعرہ ریحانہ روحی کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی، جس میں فاؤنڈیشن کی جانب سے ''انٹرنیشنل قلم فاؤنڈیشن ایوارڈ 2008'' ریحانہ روحی کو پیش کیا گیا۔

فاؤنڈیشن کی جانب سے پیش کردہ سپاس نامے میں کہا گیا کہ ریحانہ روحی دنیائے شعروادب کی وہ شاعرہ ہیں جو غزل کی زبان میں نسوانی احساسات اور کرب کو پیش کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کے یہاں عصر حاضر کی آگاہی کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں کی تقدیس کا احساس بھی موجود ہے۔ پروگرام کی صدارت سہارنپور کے کمشنر آر پی شکلا اور نظامت ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر انسپکٹر جنرل آف پولیس میرٹھ گیان سنگھ نے شرکت کی۔ اس موقع پر حسیب سوز، عقیل نعمانی، وگیان ورت، ڈاکٹر نواز دیوبندی کے علاوہ سہارنپور کے کمشنر آر پی شکلا نے اپنے کلام سے سامعین کو دیر رات تک محظوظ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 15 جون، ''بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو۔ چند کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے'' جانی پہچانی غزل گلوکارہ پیناز مسانی کے ذریعے سماج میں پھیلی ہوئی بچہ مزدوری اور بندھوا مزدوری جیسی برائیوں پر تبصرہ کرنے والی اس غزل نے سامعین کو اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کردیا۔ یہاں عالمی یوم انسداد بچہ مزدوری پر ''ایک شام بچپن کے نام'' شام غزل منعقد کی گئی تھی، جس میں سابق نائب صدر جمہوریہ بھیروں سنگھ شیخاوت سمیت راجدھانی کی مشہور و معروف شخصیتوں نے شرکت کی۔

''بچپن بچاؤ مہم'' کے تحت سری فورٹ آڈیٹوریم میں منعقد شام غزل میں پیناز مسانی کے علاوہ مشہور گلوکار طلعت عزیز اور موسیقار سمیر سین نے بھی اپنے فن کے جادو سے سامعین کو مسحور کردیا۔ بچہ مزدوری کو ملک سے ختم ہونے کے عہد کے ساتھ شروع ہوئی اس شام غزل میں فن کاروں نے ایک سے بڑھ کر ایک نظموں اور اشعار کو سروں سے سجایا جیسے جیسے شام جواں ہوئی پیناز مسانی نے اپنی موسیقی کے گلدستے کی نایاب اور منتخب شاعری سے لوگوں کو محظوظ کیا۔ رنگ و نسل کے تحت لوگوں میں امتیاز کرنے۔ اونچ نیچ تعصب برتنے والوں پر ان کے طنزیہ شعر:

اچھی صورت والے سارے پتھر دل ہوں ممکن ہے
ہم تو اس دن رائے دیں گے جس دن دھوکہ کھائیں گے

نے لوگوں سے خوب داد حاصل کی۔

اس کے بعد:

جب میری یاد ستائے تو مجھے خط لکھنا
تم کو جب نیند نہ آئے تو مجھے خط لکھنا

سمیت تمام غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا۔

طلعت عزیز کے:

زندگی جب بھی تری بزم میں لاتی ہے ہمیں
یہ زمیں چاند سے بہتر نظر آتی ہے ہمیں

غزل گاتے ہی آڈیٹوریم دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ اس کے بعد حاضرین کی فرمائش پر انھوں نے ''ڈیڈی'' فلم کی غزل:

اس بدلتی ہوئی دنیا کا خدا کوئی نہیں
سستے بازاروں میں ہر سمت خدا بکتے ہیں

پیش کر کے لوگوں کو محظوظ کیا۔ اس موقع پر ''بچپن بچاؤ مہم'' کے بانی صدر کیلاش ستیارتھی نے فن کاروں کو گلدستے پیش کر کے ان کا خیر مقدم کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مشاعرے

کیا عجب قرب کا احساس لیے بیٹھا ہوں
تو کہیں بھی ہو تجھے پاس لیے بیٹھا ہوں

نسیم نوری

● غازی آباد۔ 30 جون، ارتھلہ، موہن نگر میں پیر بابا حضرت بھورے شاہ کے عرس کے موقع پر ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت آگرہ کینٹ کے ایم ایل اے ذوالفقار احمد بھٹو اور پروفیسر وسیم بریلوی نے کی۔ راجیہ سبھا کے رکن اور بہوجن سماج پارٹی کے مغربی خطے کے رابطہ کار بابو منقاد علی مشاعرے کے مہمان خصوصی تھے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے صحت مند معاشرے کی تشکیل میں صوفیا اور شعرا کے کردار پر روشنی ڈالی۔ اتر پردیش پروجیکٹ کارپوریشن کے چیئرمین رام پرساد پردھان نے شمع روشن کر کے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ پردیپ جاٹو، امرپال شرما، مکیش جاٹو، ملوک ناگر، کے پی ماوی اور یوسف انصاری مہمانان ذی وقار کے طور پر موجود تھے۔ اس موقع پر بابا گروپ آف کمپنیز کے چیئرمین کاشی ناتھ مشرا کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر (انڈسٹریز) سید مشکور علی کو اردو خدمات کے لیے ایوارڈ پیش کیا گیا۔ مشاعرے کی نظامت معین شاداب نے کی۔ درگاہ کمیٹی کے صدر رئیس احمد اور کنوینر ڈاکٹر اعجاز شمیم کے علاوہ قاسم علی، حاجی لڈن، معراج علی اور حاجی چمن وغیرہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ شریک مشاعرہ شعرا کے اسمائے گرامی ہیں:

وسیم بریلوی، نسیم نکہت، حسیب سوز، شیاما سنگھ صبا، نسیم نوری، اقبال اشہر، معین شاداب، انا دہلوی، الطاف ضیا، دیکشت دنکوری، انور کمال انور، جاوید سعید، ممتاز نسیم، پی کے دھت اور شریف شہباز گھاٹم پوری۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اپنی تصویر بناؤ گے تو ہوگا احساس
کتنا دشوار ہے خود کو کوئی چہرہ دینا

اظہر عنایتی

● سنبھل۔ 20 جون، نگر پالیکا پریشد سنبھل کے زیر اہتمام سنبھل میں ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت چیئرمین حاجی نصرت الٰہی نے اور نظامت فاخر ادیب بجنوری نے کی۔ افتتاح ماسٹر جبار احمد نے فیتہ کاٹ کر اور سابق پرنسپل محمد راشد نے شمع روشن کر کے کیا۔ ڈاکٹر طاہر رزاقی نے مشاعرے کی گنگا جمنی روایت پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے کا آغاز وارث دہلوی اور مزمل خاں مزمل نے نعت پاک پیش کر کے کیا۔ درج ذیل شعرا نے کلام سنایا:

اظہر عنایتی، واحد انصاری مالیگاؤں، ندیم شاد دیوبندی، فیس کھتولوی، پروین لکھنوی، مشرف محضر، علی گڑھ، الطاف ضیا، ہوش نعمانی رامپوری، تبسم سنبھلی، خیال کھنہ کانپوری، خورشید حیدر مظفر نگری، وارث وارثی دہلوی، صلاح الدین اکرم، سید حسن افسر، شمیم ٹیلنش، کاشف رضا سہارنپوری، سلطان خاں کلیم، شفیق برکاتی، ڈاکٹر طاہر رزاقی، محمد عرفان، محمد یعقوب گاما ایڈووکیٹ، تصدیق الٰہی، مزمل خاں وغیرہ۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ہر گھر میں تہذیب کا جادو زندہ ہے
جب تک ہندوستان میں اردو زندہ ہے

واحد انصاری

● امروہہ۔ 13 جون، یوپی اردو ادب سوسائٹی امروہہ کے زیر اہتمام بیسواں کل ہند مشاعرہ اے کے انٹر کالج امروہہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت راشد علوی ایم پی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے محترمہ شیلا دیکشت وزیر اعلیٰ دہلی نے شرکت کی۔ شمع سید اسلوب حسین زیدی نے روشن کی۔ مولانا انیس نے نعت پاک پیش کی۔ نظامت انور جلال پوری نے کی۔ مندرجہ ذیل شعرا نے کلام سنایا۔ راحت اندوری، رئیس انصاری، نظر بجنوری، حنا تیموری، شرف نانپاروی، سہیل لکھنوی، شمیم ٹینشن حسن پوری، شبنم، خوشبو شرما، محمد نسیم فردوسی، نعیم اختر خادی، فیس کھتولوی، واحد انصاری، ساجد، سلیمان فراز حسن پوری، خالد زاہد مظفر نگری۔ (ہمارا سماج، دہلی)

بلندی پر پہنچنے کی ہوس بھی خوب ہوتی ہے
جنھیں اڑنا نہیں آتا وہ پر پھیلانے لگتے ہیں

الطاف ضیا

● سردھنہ۔ 16 جون، سردھنہ کے سالانہ ثقافتی میلے "بوڑھا بابو" میں نگر پالیکا پریشد کے زیر اہتمام گزشتہ شب کل ہند مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت الحاج عبدالوحید قریشی سابق ایم ایل اے نے کی۔ افتتاح پولیس سرکل آفیسر اودے شنکر نے لال فیتہ کاٹ کر کیا۔ شمع افروزی کی رسم سابق چیئرمین نظام انصاری، سوریہ دیو تیاگی، نریندر جین نے مشترکہ طور پر انجام دی۔ کنوینر مشاعرہ آغا عین الدین شاہ نے استقبالیہ کلمات پیش کیے جبکہ منصور عثمانی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مندرجہ ذیل شعرا نے کلام سے نوازا: خلیل احمد خلیل، افضل منگلوری، وسیم راجوپوری، الطاف ضیا، سجاد جھنجھٹ، ممتاز نسیم، عبدالسلام فریدی، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، جوہر کانپوری، شبینہ ادیب، منصور عثمانی، نعیم اختر خادی، حامد بہرائچی، عبدالستار رضا، علیم نظر، عامر میرٹھی، مشاعرے کے آغاز میں مشاعرہ کمیٹی کے ممبران تراب الدین انصاری، حاجی آصف ہیلو قریشی، محبوب لوہری، مہ جبیں مہربان اور زاہدہ ظہیر نے مہمانوں اور شعرا کا گلپوشی کر کے استقبال کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

کاش اتنا پیار دونوں طرف کی فضا میں ہو
دلّی کا دل دکھے تو کراچی تڑپ اٹھے

جوہر کانپوری

● کیرانہ۔ 24 جون، بھارتیہ سوتنتر پترکار ایسوسی ایشن اور ہندو مسلم ایکتا کمیٹی کے زیر اہتمام قومی یکجہتی کے موضوع پر ایک آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ مشاعرے کی صدارت چودھری محمد کلام اور نظامت جمال آزر بہرائچی نے کی۔ لائنس انٹرنیشنل کے گورنر رویندر سنگھل نے مشاعرے کی شمع روشن کی۔ پولیس کپتان راجو بابو سنگھ نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ مشاعرے کا آغاز جھانسی سے آئے ہوئے شاعر سرور کمال کی نعت پاک سے ہوا۔ معروف شاعر جوہر کانپوری نے ہند و پاک میں محبت قائم کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

اتنی محبتوں میں کشش چاہتے ہیں ہم
غم ہو ادھر تو کوئی ادھر بھی تڑپ اٹھے
کاش اتنا پیار دونوں طرف کی فضا میں ہو
دلی کا دل دکھے تو کراچی تڑپ اٹھے

دیگر شعرا تھے: سیما اقبال، یونس سلیم میرانپوری، گلزار بیگ جگر دیوبندی، زینت مرادآبادی، جاوید آسی راجوپوری، ہاشم فیروزآبادی، سکندر حیات گڑبڑ، سرور کمال جھانسی، شیاما سنگھ صبا، شبینہ ادیب کانپوری، ریاست علی تابش، ڈاکٹر سلیم اختر فاروقی، زخمی میرٹھی، اشوک ساحل، سجاد جھنجھٹ، خورشید حیدر، افضل منگلوری، نعیم اختر دیوبندی، علیم اختر، جگر مظفر نگری کوثر زیدی کیرانوی وغیرہ۔ مشاعرے میں یوپی مسلم کونسل کی صدر کملا سیسودیہ فلم اسٹار پو چودھری محترمہ تبسم جہاں اور دیگر کئی معززین نے شرکت کی۔ (ہمارا سماج، دہلی)

بچوں کو کیا بتاؤں بھلا گھر کے مسئلے
پھولوں کو پتھروں سے میں کیا روبرو کروں

جمال ہاشمی

● کھتولی۔ 15 جون، کھتولی میں گزشتہ شب ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں خالد زاہد کو ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ محلہ قاضیان کے وسیع و

عریض چوک میں ادبی تنظیم بزم جگر کے تحت مشاعرے کا افتتاح کھتولی شہر کے چیئرمین حاجی شاہ نواز لالو کی صدارت میں ہوا، جب کہ شہر کوتوال جواہر لال نے شمع روشن کی اور فیتہ کاٹنے کی رسم زاہد امیر نے ادا کی۔ مہمان شاعر خالد زاہد کی نعت پاک سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے نوازا ان کے اسمائے گرامی ہیں: الطاف ضیا، نعیم خادمی، خالد زاہد، نجم الاسلام نجم، جمال ہاشمی، ممتاز نسیم، افضل منگلوری، حامد بہرائچی، جاوید آسی، اس موقع پر خالد زاہد مظفر نگری کو حکیم سعید اشتیاق حسین ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا اور چیئرمین حاجی شاہنواز لالو نے بزم جگر کی جانب سے ممتاز نسیم کو خصوصی اعزاز سے نوازا۔ اس موقع پر کاشف رضا، عبدالستار اثر، فیس کھتولی، محمد سید سلیم اختر، وغیرہ نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی نظامت راحت منگلوری نے کی۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

خنجر تو قتل کرکے چھپایا گیا بہت
اس کو خبر نہ تھی کہ لہو بولتا بھی ہے

معراج نشاط

● علی گڑھ۔ 24 جون، بزم اسیر علی گڑھ کے زیر اہتمام گزشتہ دنوں امان اللہ خالد سکندرآبادی اور سالم شجاع سالم فیروز آبادی کے اعزاز میں کیلا نگر روڈ پر واقع تاج اسپتال میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت میکش امروہوی نے کی اور نظامت کے فرائض مقصود جالب، ساحل فیروز آبادی نے انجام دیے۔ محترمہ راشدہ باقی حیا دہلوی، کنور طیب علی خاں، نسیم نوری، ظفر کامل اور ولی محمد عباسی مہمانانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ بزم اسیر کی جانب سے امان اللہ خالد کو "پاسبانِ زبان وادب" اور سالم شجاع کو "شہزادۂ ادب" کے خطابات سے نوازا گیا اور اسناد افتخار پیش کی گئیں۔ بانی مشاعرہ ڈاکٹر نجم الدین انصاری نے شعرا کی گل پوشی کی۔ مشاعرے کا آغاز ذکیہ فیروز نے نعت پاک سے کیا۔ آفرین فیروز نے بہاریہ دور کا آغاز کیا۔ شریک شعرا کے اسمائے گرامی ہیں: میکش امروہوی، امانت اللہ اسیر، خالد فریدی، معراج نشاط، نسیم نوری، شکیل دانش مارہروی، راشدہ باقی حیا دہلوی، امان اللہ خالد سکندرآبادی، سالم شجاع فیروز آبادی، مقصود جالب، جانی فاسٹر، انور غازی آبادی، الیاس تائب خیرآبادی، ممتاز نسیم، انجم شاہجہانپوری، کلیم نوری فیروز آبادی، زیرو باندوی، عرفان ساحل فیروز آبادی، شکیل سکندرآبادی، امجد رضا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

لوگ چہرہ چھپانے لگے
جب سے میں آئینہ ہوگیا

اشفاق قمر

● خورجہ۔ 2 جولائی، دارالغزل کے زیر اہتمام "جشن ڈاکٹر محمد طاہر رزاقی" کے عنوان سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت خلیفہ حافظ رمضانی نے کی اور افتتاح انور حسین خاں نے کیا جب کہ شمع افروزی محمد فرقان قریشی نے کی۔ بحیثیت مہمانِ خصوصی حاجی رفیق قریشی پھڈا نے شرکت کی۔ دارالغزل کی جانب سے صاحب جشن ڈاکٹر محمد طاہر رزاقی کو تحائف، سند افتخار اور شال پیش کی گئی۔ نظامت کے فرائض اویس جمال شمسی نے انجام دیے۔ خورجہ کی ایک اور فعال بزم بزم انجم کی جانب سے بھی صاحب جشن کو تحفوں سے نوازا گیا۔ مشاعرے کا آغاز ہدیۂ نعت سے پروین لکھنوی نے کیا۔ مشاعرے میں درج ذیل شعرا نے کلام سنایا: ڈاکٹر محمد طاہر رزاقی، ڈاکٹر رہبر برنی، ڈاکٹر مکرم احمد خاں ادنیٰ، شاعر الجمیل، اویس جمالی شمسی، محمد حنیف آرزو، سلطان محمد خاں کلیم، سید حسین افسر، ایم مبشر قمر، کامل جنیٹوی، مزمل سنبھلی، فیضان لکھنوی، سید عادل وفا سہارنپوری، خالد زاہد، صابرہ تبسم، شفیق برکاتی، عامر میرٹھی، پروین لکھنوی، اشفاق ثمر کوسوی، شکیل سحر ایٹوی، مشرف حسین محضر، ڈاکٹر مجیب شہزر، توفیق آزاد ایڈووکیٹ، آس محمد فراز، سلیمان فراز ڈاکٹر انتظار اختر انصاری، مشرف حسین چندر، وسیم اجھاروی، مہربان تاجر۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ہر ایک اینٹ میں پوشیدہ ہے مری تہذیب
پرانی شکل میں میرا مکان رہنے دو

امتیاز دانش

● آرا۔ 28 جون، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرا کے شعبۂ اردو و فارسی کے زیر اہتمام گذشتہ دنوں شیوا ہوٹل آرا میں ایک عظیم الشان مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت الٰہ آباد یونیورسٹی کے عبدالقادر صغیری نے کی۔ اس موقع پر ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرا کے صدر شعبۂ اردو و فارسی ڈاکٹر حسین نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مشاعرے کی اہمیت وافادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مشاعرے کے اختتام پر انھوں نے تمام شرکا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور مشاعرے کی کامیابی پر مسرت کا اظہار کیا۔ اس پروگرام میں اردو، ہندی سے تعلق رکھنے والے شعرائے کرام نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی نظامت ہزاری باغ یونیورسٹی کے ڈاکٹر زین رامش نے کی۔ اس موقع پر شہباز وارث خاں نے بہادر شاہ ظفر کا کلام پیش کیا: اس مشاعرے او رکوی سمیلن میں جن شعرا نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں: عطاالرحمٰن عطا، قربان آتش، اسرار سیفی، امتیاز دانش، ڈاکٹر محمد صدر عالم صدیقی، جمال جوہر نوری، جسیم باری، اشک بھوجپوری۔ ارمیلا کول، گھنشیام چودھری وغیرہ نے نظمیں سنائیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پھر سے لکھنا ہے شب غم مجھے افسانہ ترا
پھر سے اک بار ذرا شام کا منظر ہو جا

شاہد محمود خاں

● رام پور۔ 14 جون، حکیم سید فخر الاسلام رضوی میراں پوری کی رام پور آمد پر ان کے احباب نے ایک مخصوص شعری نشست کا اہتمام کیا۔ حمایت اللہ بلڈنگ میں واقع ''ہمارا سماج'' کے دفتر میں ہونے والی اس نشست کی صدارت میونسپل بورڈ کے چیئرمین سردار جاوید خاں نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض کاشف خاں نے انجام دیے۔ مولانا ارشاد بدانو کانوی نے مہمان شاعر کا تعارف کرایا اور بتایا کہ فخر الاسلام رضوی صاحب کا کلام اس صنف سخن سے تعلق رکھتا ہے، جہاں شاعر اپنے قاری یا سامع کو زندگی میں باعمل رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ ان کی شاعری موجودہ وقت کی شاعری ہوتے ہوئے بھی ملت اسلامیہ کے روشن ماضی کی علامت ہے۔ نشست میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا، ان کے اسمائے گرامی ہیں: فخر الاسلام رضوی میراں پوری، شاہد محمود خاں، ڈاکٹر ظہیر رحمتی، س ش عالم، سردار جاوید خاں، ڈاکٹر فرید صدیقی، فرید شمسی، نوید قیصر، بدانو کانوی، نشست میں بزم اہل سخن کے صدر انتظام محمد شیر، اشرف شاہ خاں چغتائی، محی الدین خاں ادیب، حمایت اللہ خاں، خالد میر سہسوانی، ناصر علی خاں، خوشنود خاں، عزیز احمد خاں، بھیئے خاں، وسیم عالم خاں، جمیل احمد، محفوظ خاں وغیرہ موجود تھے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

رسم اجرا

''کلامِ نساخ''

● کولکاتا۔ 28 جون، ملک کی نامور شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر شہناز نبی کی نئی کتاب ''کلام نساخ'' کی رسم رونمائی بکاش رنجن بھٹا چاریہ (میئر کولکاتا میونسپل کارپوریشن) کے ہاتھوں پچھلے دنوں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر شہناز نبی نے اپنی تقریر میں کہا کہ نساخ اردو کا ایک بڑا شاعر تھا جس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اسے بیک وقت شاعری اور نثر نگاری دونوں پر دسترس حاصل تھی۔ افسوس کہ ہم نے اسے صحیح مقام نہیں دیا۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری محمد سلیمان خورشید نے کہا کہ نساخ پر لکھنے والوں نے وہ توجہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان کے ہم عصروں اور شاگردوں نے بھی اپنا حق ادا نہیں کیا۔ شہناز نبی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو کے ایک عظیم شاعر کی ادبی حیثیت متعین کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی۔ ڈاکٹر اتیش داس گپتا (ڈائرکٹر اسٹیٹ آرکائیوز) نے کہا کہ یہ ایک بڑا اور اہم کام ہے۔ شہناز نبی نے نساخ کی شاعری، ان کے ادبی کارناموں کو جس طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے لیے انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ صدر مجلس مولانا محمد اسحاق نے صدارتی تقریر میں نساخ کی حیات اور فن پر بھرپور روشنی ڈالی، نیز کہا کہ نساخ کے اجداد نے بنگال کے مسلمانوں میں جدید تعلیم پھیلانے کا بڑا اہم کام کیا تھا۔ انھوں نے سرسید احمد سے تقریباً دس سال قبل بنگال کے مسلمانوں کو انگریزی سے آشنا کرانے کا کام انجام دیا۔ اس موقع پر وزیر برائے اقلیتی امور و مدرسہ تعلیم ڈاکٹر عبدالستار، جادب یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر آملیندو دوے، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابن کنول وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا جب کہ معروف فنکار سہیل رانا نے نساخ کی غزلیں پیش کر کے ماحول کو خوبصورت بنایا۔ (ہمارا سماج، دہلی)

''مجتبیٰ حسین اور گلبرگہ''

''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''

● ''مجتبیٰ حسین، اور گلبرگہ'' مرتب جناب احسان اللہ احمد اور ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' مصنف جناب عابد مرزا کی تقریب رسم اجرا 28 جون 2008 ساڑھے آٹھ بجے شب، بمقام خواجہ بندہ نواز ایوانِ اردو زیر صدارت پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی حیدرآباد منعقد ہوئی۔ پروفیسر بیگ احساس نے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ کسی فنکار کو کسی خاص علاقے سے منسوب کرنا ناانصافی ہے، مگر یہ اہل گلبرگہ کا خلوص ہے کہ وہ اپنے فنکاروں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی پیدائش گلبرگہ میں ہوئی مگر انھوں نے شعور کی آنکھ حیدرآباد میں کھولی۔ آج کل مابعد جدیدیت میں بھی علاقائیت کی اہمیت کو اجاگر کیا جارہا ہے۔ جلسے کے آغاز میں جناب الیاس صابری نے حمدیہ اشعار پیش کیے۔ جناب ولی احمد نے خیر مقدم کیا۔ پروفیسر حمید سہروردی نے مہمانوں کا تعارف کرایا صدر جلسہ پروفیسر بیگ احساس، جناب احسان اللہ احمد، جناب عابد مرزا، پدم شری مجتبیٰ حسین، جناب اسد ثنائی اور مہمانانِ خصوصی جناب اقبال احمد سرڈگی، ایم پی اور جناب قمرالاسلام ایم ایل اے کی گلپوشی کرتے ہوئے شال کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ جناب اقبال احمد سرڈگی نے ''مجتبیٰ حسین اور گلبرگہ'' کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ ناسازی مزاج کے باوصف مجتبیٰ حسین کی کشش انھیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ مجتبیٰ حسین صاحب کے سیاست دانوں سے بھی قریبی تعلقات قائم ہیں، مگر اپنی تحریروں میں وہ اہل سیاست کو نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس کی ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہو۔ جناب عابد مرزا کی طنز و مزاح پر مشتمل کتاب ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' کی رسم اجرا مجتبیٰ حسین نے انجام دی۔ مہمان خصوصی جناب قمرالاسلام نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اہل گلبرگہ مجتبیٰ حسین کو عالمگیر شخصیت قرار دیتے ہیں تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں کیونکہ ان کے

مضامین کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انھوں نے انجمن کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس کے ذریعے ادبا و شعرا کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ (ڈاک سے)

''فصل زخم'' اور ''بنجارہ''

● بھیونڈی کے معروف ادبی اور تعلیمی ادارے، اردو قبیلہ کے زیر اہتمام گذشتہ دنوں دو شعری مجموعوں کا اجرا ہوا اور اسی موقع پر بھیونڈی کے معروف افسانہ نگار جناب ایم مبین کو استقبالیہ دیا گیا۔ تقریب اجرا کی صدارت مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری نے فرمائی۔ جبکہ معروف شاعر عرشی جونپوری کے مجموعۂ کلام ''فصل زخم'' کا اجرا جناب محمد افضل انصاری کے ہاتھوں اور جناب عرفان جعفری کے مجموعۂ کلام ''بنجارہ'' کا اجرا جناب انعام الحق انصاری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اردو قبیلہ کے صدر کامریڈ اسرار احمد انصاری نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ اردو قبیلہ کے جنرل سکریٹری اختر کاظمی نے جناب ایم مبین کا مختصر تعارف پیش کیا۔ بھیونڈی کارپوریشن کے میئر جناب جاوید غلام محمد دلوی نے مہاراشٹر ہندی ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اپنے ہندی افسانوں کے لیے منشی پریم چند ایوارڈ پانے والے جناب ایم مبین کو شال، گلدستہ اور مومینٹو دے کر ان کا استقبال کیا۔ معروف صحافی اور فلمی نغمہ نگار جناب حسن کمال نے جناب عرفان جعفری کی گلپوشی کی، شال اور گلدستہ پیش کیا۔

اس موقع پر جناب محمد رفیع انصاری اور جناب امیر حمزہ ثاقب نے مرحوم عرشی جونپوری کے فن اور ان کی شخصیت پر مضمون پڑھا۔ جناب حسن کمال، پروفیسر عرفان فقیہ، جناب علی ایم شمسی، جناب ساجد رشید، پروفیسر قاسم امام، جناب مصطفیٰ پنجابی، ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ، جناب ممتاز راشد، جناب عرفان جعفری اور صدر جلسہ مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب کی نظامت مشترکہ طور پر کامریڈ عبدالجلیل انصاری اور مخلص مدعو نے کی جبکہ اردو قبیلہ کے رکن انجینئر محمد اکرم انصاری نے تمام مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں سامعین کے ذوق کی تسکین کے لیے جناب شبیر گلابی نے اپنے دیگر ہمنواؤں کے ساتھ مل کر کئی غزلیں پیش کیں۔

(ڈاک سے)

● سول لائن کانپور میں 15 جون کی شب میں 9 بجے مولانا قمر شاہجہانپوری قاضی شہر کانپور کے مجموعۂ کلام ''آب شیریں'' کی رسم اجرا ملک زادہ منظور احمد کے ہاتھوں اور ''حیات و خدمات'' مرتب سید محمد اطہر کی رسم اجرا شری پرکاش جیسوال وزیر داخلہ حکومت ہند کے ہاتھوں ادا کی گئی۔ مولانا قمر شاہ جہانپوری کی علمی ادبی و مذہبی خدمات کے اعتراف میں ''افق نو'' سہ ماہی شاہ جہانپور نے خصوصی نمبر شائع کیا ہے جس کا اجرا سید محمد مہدی رضوی نے کیا۔ جناب وی سی مصرا چیئرمین لا کمیشن حکومت اتر پردیش نے شمع روشن کر کے اس تقریب کا افتتاح فرمایا۔ قاری کلیم نوری ماریشس کی تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔ اہم شخصیات کی گل پوشی کونسل کے سرپرست انصار احمد خاں نائب صدر شفیق الرحمٰن، جنرل سکریٹری معین الاسلام، سکریٹری سید محمد اطہر اے جے خان زبیر احمد اور نوشاد احمد نے کی۔ ممبئی کے ابوطالب نے نعت و منقبت کے اشعار سنائے۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے مولانا قمر شاہجہانپوری کی شخصیت و شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ڈاکٹر خالد حسین خاں نے اپنے مقالے میں مولانا قمر شاہ جہانپوری کی پچاس سالہ ادبی، مذہبی و سماجی خدمات کے اعتراف میں ایک مکمل کتاب کی اشاعت پر زور دیا۔ جناب عبدالعلی عزیزی محمد نیشنل کمیشن فار بیک ورڈ کلاسز نئی دہلی نے بھی۔ مولانا قمر شاہجہانپوری کی شاعری اور فکر و فن کو سراہا۔ شری پرکاش جیسوال اور جسٹس وی سی مصرا بھی۔ سامعین کو مخاطب کیا۔ آخر میں ایک کل ہند مشاعرہ ہوا جو رات دو بجے تک جاری رہا۔ (ڈاک سے)

● سنبھل صحافت قوم کی ذہن سازی کا مقدس فریضہ ہے جنگ آزادی میں اردو صحافت کا کردار بے مثال ہے تو دور حاضر کی دہشت گردی، جرائم اور سیاسی بحران میں اسی طرز کی صحافت کی آج اشد ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار اتر پردیش پروجیکٹ کارپوریشن کے نائب صدر اور وزیر مملکت ڈاکٹر سنجیولال نے وکرم پیلس سنبھل میں انجینئر محمد فرقان سنبھلی کی کتاب ''اردو صحافت اور ضلع مرادآباد'' کی تقریب اجرا سے خطاب میں کیا۔ اس تقریب کا انعقاد پترکار سنگھ، سنبھل کے زیر اہتمام کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سنجیولال نے گنیش شنکر ودیارتھی، مولانا آزاد وغیرہ کے صحافتی کردار سے سیکھ لینے کی تلقین کی اور کہا کہ ملک و ملت کی خدمت میں آج صحافی تمام خطرات کا سامنا کرتے ہوئے بھی سچ کو سامنے لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ پترکار سنگھ کے صدر نریش شکلا نے رسم اجرا سے قبل فرقان سنبھلی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی پہلی دو کتابیں (1) مصر قدیم (2) آئینۂ فلکیات منظر عام پر آکر بے حد مقبول ہوئیں۔ دینک جاگرن کے رونددر پرساد نے کتاب کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔ جبکہ صحافی امراجالا دیو شرما نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں کتاب کی اشاعت کو بہتر قدم بتاتے ہوئے کہا کہ اس سے ہندی والے بھی اردو صحافت سے واقف ہو سکیں گے۔ اس موقع پر انجینئر محمد فرقان سنبھلی نے کہا کہ مخالف حالات کے باوجود آج کا صحافی بے باک اور ایماندار ہے۔ صحافیوں کو تلوار کی دھار پر چلنا پڑ رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہرداری لال گوتم، ابھے پال رستوگی، نسیم سیفی، رفعت اللہ، بھیشم سنگھ دیول وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

صدارت نریش شکلا نے اور نظامت دلیپ گپتا اور مظفر نبی نے کی۔

(ڈاک سے)

● ''یوگین کادیہ'' ہندی رسالے کی جانب سے مولانا آزاد بھون، سانتا کروز، ممبئی میں سید ریاض رحیم کے شعری مجموعے ''پوچھنا ہے تم سے اتنا'' (ہندی رسم الخط) کی رسم اجرا ہندی کے ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر نند لال پاٹھک کے ہاتھوں عمل میں آئی پروفیسر خورشید نعمانی نے صدارت کی اور آلوک بھٹا چاریہ نے نظامت کی۔ ''یوگین کادیہ'' کے مدیر ہستی مل ہستی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ہردیش مینک نے سید ریاض رحیم کی غزلوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہمیں ان سے جو امیدیں تھیں وہ اس پر کھرے اترے ہیں۔ ڈاکٹر کرونا شنکر اپادھیائے نے کہا کہ سید ریاض نے اپنے آس پاس کی سچائیوں کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر راجیم نٹراجن نے کہا کہ بہت دنوں بعد ہمیں ایک بہت اچھی کتاب پڑھنے کو ملی ہے۔ وحید اختر انصاری نے کہا کہ سید ریاض کی غزلوں میں دنیا لفظ بار بار استعمال ہوا ہے اور انھوں نے ہر بار اس لفظ کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ اردو شاعر عبداللہ کمال نے اپنے مقالے میں کہا کہ سید ریاض کا ہر شعر سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ ایک بڑا کمال ہے جو ایسے شاعروں کو میسر آتا ہے جو شعر نہیں کہتے بلکہ شعر جیتے ہیں۔ آدم شیخ نے کہا کہ ان کی شاعری دلوں کو چھوتی ہے۔ وہ اردو یا ہندی کے نہیں خالص ہندوستانی کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں شعوری یا لاشعوری طور پر دکنی تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔ پروفیسر خورشید نعمانی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ سید ریاض رحیم کی شاعری میں انسان دوستی، محبت، ہمدردی کا جذبہ حاوی و ساری ہے۔ ان کی فکری اساس اپنے معاصر شعرا سے قدرے مختلف ہے۔ انداز بیان بھی خوب ہے۔ آخر میں آلوک بھٹا چاریہ کے شکریے پر تقریب کا اختتام ہوا۔

(ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 12 جون، دہلی کی وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے آج دہلی سکریٹریٹ میں ایک سادہ تقریب میں ست پال کی پہلی کتاب ''تمن میں نہ تیرہ میں'' کا اجرا کیا۔ اس کتاب میں غیر سیاسی طنزیہ مضامین ہیں جو گزشتہ کچھ سالوں میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں طنزیہ انداز میں احساسات کو زبان دی گئی ہے۔ اس موقع پر وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے کہا کہ کتاب کو دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں طنز کو انوکھے انداز میں پیش کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر اے کے والیا نے کی جبکہ ڈاکٹر یوگا نند شاستری، رماکانت گوسوامی، اٹل بھاردواج، پشپیندر سنگھ، سدھیر تیلنگ اور وزیر اعلیٰ کے پرنسپل سکریٹری کے ترپاٹھی نے مہمانانِ ذی وقار کے طور پر شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

وفیات

غلام محمود بنات والا

● ممبئی۔ 25 جون، انڈین یونین مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر اور رکن پارلیمنٹ غلام محمود بنات والا کا آج ممبئی میں اپنی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ انتقال کی خبر سے تعلیمی، سیاسی اور مسلم حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ انھیں ان کی گرانقدر خدمات کے عوض مسلم تنظیموں نے فضل الحق ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔ موصولہ اطلاع کے مطابق غلام محمود بنات والا ممبئی کے مراٹھا مندر جیہ علاقے میں واقع تائن فٹ آگری پاڑہ میں اپنی رہائش گاہ پر ظہرانہ تناول فرمانے کے بعد بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ فوراً انھیں اسماعیلیہ اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں داخلے سے قبل ہی ان کی حرکت قلب بند ہوگئی اور اور وہ دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم کے بھتیجے اسماعیل بنات والا نے بتایا کہ وہ آج صبح ہی مدراس سے مسلم لیگ کی 75 ویں تاسیس کا جشن منا کر ممبئی آئے تھے۔ بنات والا عمر کھاڑی پارلیمانی حلقے سے انتخاب میں فتح حاصل کرنے کے بعد 1963 سے 1977 تک ممبر پارلیمنٹ رہے۔ مرحوم کی اہلیہ کا گیارہ برس قبل ہی انتقال ہو چکا تھا، وہ 7 مرتبہ لوک سبھا کے ممبر رہے۔

احمد یوسف

● پٹنہ۔ 19 جون، اردو فکشن کے ایک اہم ستون، مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر احمد یوسف آج سینکڑوں سوگواروں کے درمیان خواجہ کلاں میں واقع اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیے گئے۔ بہار اردو اکادمی کے سابق نائب صدر ڈاکٹر احمد یوسف کا گذشتہ شب انتقال ہوگیا تھا۔ آج محمدی جان وقف اسٹیٹ کی مسجد میں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب کے سجادہ نشیں سید شاہ مصباح الحق عمادی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور بعد نماز عصر انھیں ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں ادبی اور سماجی حلقوں سے تعلق رکھنے والی معزز شخصیتیں موجود تھیں۔ ڈاکٹر احمد یوسف کے آخری سفر اور ان کی تدفین کے موقع پر ادبی حلقے کی ممتاز شخصیتیں موجود تھیں۔ احمد یوسف 1930 میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ناول پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی جہاں ان کو رشید احمد صدیقی جیسے بلند پایہ ادیب کی رہنمائی حاصل ہوئی۔ انھوں نے 1948 میں پہلا افسانہ لکھا۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''روشنائی کی کشتیاں'' ''آگ کے ہمسائے'' ''23 گھنٹے کا شہر'' ''اور رزم یا بزم'' شائع ہوئے۔ حال ہی میں ان کے تین ناولٹ کا مجموعہ ''جلتا ہوا جنگل''

منظر عام پر آیا تھا۔ وہ رشید احمد صدیقی سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے 1948 میں پٹنہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی۔ ڈاکٹر احمد یوسف نے اردو ادب کی بے لوث خدمت کی۔ وہ جتنے اچھے فکشن نگار تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی تھے۔ سنجیدگی، متانت اور انکساری ان کا خاص وصف تھا۔

رفیعہ منظور الامین

● حیدرآباد۔ 30 جون، اردو افسانہ نگار محترمہ رفیعہ منظور الامین نے آج تقریباً 78 سال کی عمر میں ایک بجے دن داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کے انتقال کی خبر سے شہر کے ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ وہ طویل عرصے سے علیل تھیں۔ مرحومہ اپنے شوہر جناب منظور الامین صاحب سابق ایڈیشنل ڈائرکٹر دوردرشن کے ساتھ حیدرآباد میں مقیم تھیں۔ پسماندگان میں شوہر کے علاوہ دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی بڑی صاحبزادی ڈاکٹر ذیشان سمیع الدین ہوسٹن امریکہ میں مقیم ہیں، جب کہ ان کی دوسری لڑکی فروزاں فہیم وارثی جدہ میں ہیں۔ مرحومہ صاحب طرز ادیبہ تھیں۔ انھوں نے دستک سی در دل پر، یہ راستے، آہنگ اور عالم پناہ جیسے معیاری اور اعلیٰ ادبی میعار کے حامل ناولوں کے علاوہ زائد از 200 کہانیاں تحریر کیں۔ محترمہ نے 12 ٹیلی فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں۔ ان کے ناول عالم پناہ پر ایک ٹی.وی. سیریل ''فرمان'' دوردرشن حیدرآباد سے پیش کیا گیا۔ انھیں ان کی تخلیقات پر مختلف ریاستی اردو اکادمیوں سے ایوارڈ حاصل ہوئے۔ نماز جنازہ یکم جولائی 2008 مسجد باغ عامہ میں بعد نماز ظہر ہوئی۔ بعد ازاں تدفین ان کے آبائی قبرستان مسجد عباداللہ چنچل گوڑہ میں عمل میں آئی۔

شاہد نوحی

● کھتولی۔ کرتپور۔ 28 جون، مظفر نگر کے معروف شاعر مرزا محمد ابراہیم شاہد نوحی کا آج قریب 4 بجے انتقال ہوگیا۔ وہ نوح ناروی کے شاگرد تھے ان کا کرتپور سے خاص لگاؤ تھا۔ ابرار کرتپوری اور ظہیر احمد گوہر کرتپوری شاہد نوحی کے شاگردوں میں ہیں۔ ان کی شاعری ان کی یادوں کو ہمیشہ تازہ رکھے گی۔

صالحین فہمی

● نئی دہلی۔ 21 جون، دہلی کے معروف نوجوان شاعر اور سماجی کارکن صالحین فہمی کو آج دوپہر قبرستان دہلی گیٹ میں سپرد خاک کردیا گیا۔ تدفین میں دہلی کی ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی۔ صالحین فہمی جن کی پیدائش 5 نومبر 1961 کو کوچہ رحمن چاندنی چوک میں ہوئی تھی بچپن سے ہی سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو ان کی شاعری تھی وہ اپنی مسحور کن آواز سے سامعین کے دلوں میں اتر جاتے تھے۔ صالحین فہمی سادہ مزاج اور نیک دل انسان تھے اور ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے دہلی کے تاریخی لال قلعے کے مشاعرۂ جشن جمہوریت، مشاعرہ یوم آزادی کے علاوہ ہندوستان کے متعدد شہروں کے علاوہ پاکستان میں بھی دہلی کے نوجوان شعرا کی نمائندگی کی تھی۔ حالانکہ ابھی تک ان کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا تھا لیکن کے ان درجنوں اشعار لوگوں میں عام ہیں۔

پران کیلا

● نئی دہلی۔ اردو کے ایک خاموش پرستار پران کیلا کا جو تقریباً 35 برس تک انشائیے اور افسانے لکھتے رہے یکم جون کو حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال ہوگیا۔ وہ 76 سال کے تھے۔ پران کیلا پاکستان میں پیدا ہوئے تھے اور ملک کی تقسیم کے بعد نئی دہلی چلے آئے تھے۔ پسماندگان میں ان کی بیوہ، ایک بیٹا اور ایک بیوہ بیٹی شامل ہیں۔ یہاں وہ تعمیرات عامہ سے منسلک رہنے کے بعد قبل از وقت ریٹائر ہوکر سعودی عرب ملازمت کے لیے گئے جہاں دس سال تک ملازمت کی۔ وہ اقوام متحدہ کے ادارے Indian Fedreration for Association کے سکریٹری بھی رہے اور تادم آخر اس منصب پر فائز رہے۔ وہ پریس کلب اور انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے ممبر بھی تھے۔ یکم جون کو حالانکہ ان کا انتقال ہوا لیکن اردو برادری کو اس کی اطلاع میڈیا کے توسط سے 20 جون کو ملی۔ جس طرح انھوں نے اردو زبان و ادب کی خاموشی سے خدمت کی اسی طرح وہ خاموشی سے اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ وہ پریم چند کے اتنے بڑے مداح تھے کہ ان کے نام پر وہ ایک ریسرچ سنٹر قائم کرنا چاہتے تھے اس سلسلے میں انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے پریم چند کی بیشتر تصانیف حاصل کی تھیں۔

□□□

● بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔ گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔ اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

تبصرہ و تعارف

• کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد دوم)

مرتب: وارث علوی

صفحات: 655، قیمت: 380 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: ابوبکر عباد، ڈپارٹمنٹ آف اردو، یونیورسٹی آف دہلی، دہلی-7

وارث علوی ہمارے عہد کے اہم ناقد ہیں۔ وہ عالمی ادب کی اچھی بصیرت اور اردو فکشن پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عمر عزیز اردو نقد و ادب کے لیے وقف کرنے کے باوجود انھوں نے نہ تو کوئی ادبی گروہ بنایا اور نہ اس نوع کے کسی گروہ سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے تنقیدیں نہ تو ذاتی مفاد کے لیے لکھیں اور نہ ہی کم اہلوں کو سند اعتبار بخشنے کے لیے۔ وہ جیسی شستہ، برجستہ اور رواں زبان لکھتے اور اپنے خیالات کا جس قدر منطقی اور مدلل اظہار کرتے ہیں فی زمانہ اردو میں ایسے ناقدوں کی گنتی انگلی کی محض ایک پوروں پر کی جاسکتی ہے۔ ان کی تنقید متعلقہ لوگوں کو جراحت بھی پہنچاتی ہے، چرکے بھی لگاتی ہے اور تلملانے پر مجبور بھی کرتی ہے اس کے باجود ان پر تعصبات و تحفظات اور جانبداری برتنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ بات سچی، کھری اور دوٹوک کرتے ہیں۔ بیجا صفات اور غیر ضروری الفاظ کے استعمال کے معاملے میں گوکہ وہ بے حد کنجوس واقع ہوئے ہیں تاہم کلاسیکی علوم اور ادبی معلومات کے دھنی ہیں۔ منٹو کے افسانوں کے تجزیے، جدید افسانہ اور افسانہ نگاروں پر بے لاگ رائے اور نئی تنقید اور نئے نقادوں سے متعلق اپنی گفتگو کے حوالے سے وارث علوی کی ایک خاص پہچان ہے۔

زیر تبصرہ کتاب "کلیات راجندر سنگھ بیدی" (جلد دوم) اپنے موضوع کے اعتبار سے تحقیق و ترتیب کے زمرے میں آتی ہے لیکن یہ ترتیب کی منزل سے آگے نہیں بڑھ پائی۔ خدا جانے ہمارے اہم ناقد کو یہ تحقیقی کام کس مجبوری کے تحت اپنے ذمے لینا پڑا، کہ اپنی حتمی شکل میں نہ تو یہ کتاب تحقیق کے اصولوں پر پوری اترتی ہے اور نہ ہی صاحب کتاب بطور محقق کامیاب ہو سکے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب کی ترتیب مستند ہے پھر بھی عام قاری کے لیے کتاب کے مطالعے سے ترتیب/تحریر کے استناد پر یقین کرنا مشکل ہے کہ بیدی کی بعض تحریروں کے بارے میں یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ کب اور کہاں شائع ہوئیں۔ اور نہ بعض خطبے کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کس جلسے یا تقریب میں دیے گئے ہیں۔ وارث علوی صاحب نے بیدی کی بیشتر تحریروں سے متعلق پروفیسر شمس الحق عثمانی کی ایک کتاب "باقیات بیدی" پر اعتماد و اکتفا کیا ہے، کہیں اور کچھ بھی تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

کلیات راجندر سنگھ بیدی کی یہ دوسری جلد بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین اور خطوط پر مشتمل ہے۔ ناولٹ، ایک چادر میلی سی" پر وارث علوی کا تعارفی مضمون عمدہ ہے جو اس ناولٹ اور بیدی کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کلیات میں بیدی کے ڈراموں کی دونوں کتابیں "بے جان چیزیں" اور "سات کھیل" شامل ہیں جن کے ڈراموں کی مجموعی تعداد گیارہ ہے۔ بقول وارث علوی، بیدی سیدھی سادی کہانی پر شاہکار افسانے لکھتے ہیں لیکن سیدھے سادے پلاٹ کو پر تجسس اور پر تکلف ڈرامے میں نہیں بدل سکتے۔" لیکن سچ تو یہ ہے کہ بیدی کے کئی ڈرامے بے حد اچھے ہیں۔ "رخشندہ" بیدی کا علامتی ڈراما ہے، "آج" اور "روح انسانی" سیاسی نوعیت کے ڈرامے ہیں، اور "چانکیہ" اور "خواجہ سرا" کے پس منظر تاریخی ہیں۔ "چانکیہ" میں ہندی شیلی اپنے شباب پر ہے تو خواجہ سرا میں مفرس اردو کی رنگینی اور شیرینی قابل داد ہے۔ "کارکی شادی" اور "ایک عورت کی نہ" ظرافت کی چاشنی سے پر سیدھے سادے گھریلو ڈرامے ہیں۔ "تلچھٹ" کے بارے میں مظفر علی سید کا خیال ہے کہ "یہ ڈراما ایک روسی کہانی پر مبنی ہے اور موضوع کو دیسی بنانے کی شدید کوشش کے باوجود ڈراما بدیسی ہی رہتا ہے۔" "نقل مکانی" بیدی کا مشہور اور بہترین ڈراما ہے جس پر خود بیدی نے 1970 میں "دستک" کے نام سے ایک فلم بنائی تھی جسے متعدد ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ حاصل ہوئے تھے۔ "بے جان چیزیں" وارث علوی کے مطابق "کافی بے جان ڈراما ہے۔"

کلیات میں شامل بیدی کے مضامین کی تعداد انتیس ہے جن میں سوانحی اور صحافتی نوعیت کے مضامین ہیں، انشائیے ہیں، خاکے ہیں، اجلاس میں پڑھے گئے خطبے ہیں، اپنی اور دوسروں کی کتابوں پر لکھے گئے دیباچے، اور پیش لفظ ہیں اور بعض تبصراتی، تاثراتی اور تنقیدی مضامین ہیں۔ وارث علوی صاحب نے بیدی کی صرف ان تحریروں کے آخر میں زمانۂ اشاعت لکھا ہے جو پروفیسر

شمس الحق عثمانی کی مرتب کردہ کتاب ''باقیات بیدی'' سے انھوں نے لی ہیں بقیہ تحریروں سے متعلق— جن میں بیدی کے بعض اہم مضامین شامل ہیں— انھوں نے کسی طرح کی معلومات حاصل کرنے یا قارئین کو فراہم کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔

جن تحریروں کا زمانۂ اشاعت اور جس اخبار یا رسالے میں یہ تحریریں شائع ہوئیں ان کے نام نہیں لکھے گئے یہ ہیں:

چلتے پھرتے چہرے، بیوی یا بیماری، باقر مہدی کے تعلق سے، خواجہ احمد عباس، گیتا (بالی)، فلم بنانا کھیل نہیں، آئینے کے سامنے، مہمان، ترک غمزہ زن، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔

بیدی کے مضامین کی فہرست میں ''علی گڑھ میں خطاب'' کے عنوان سے ایک مضمون ہے جسے شمس الحق عثمانی نے بیدی کا مضمون قرار دیتے ہوئے اپنی کتاب ''باقیات بیدی'' میں شامل کیا ہے۔ واضح ہو کہ اسی تحریر کا عنوان عثمانی صاحب کا قائم کیا ہوا ہے۔ جناب وارث علوی نے بھی عثمانی صاحب کا اتباع کرتے ہوئے اسے کلیات میں اسی عنوان سے جگہ دی ہے۔ تقریباً ڈھائی صفحے کی یہ تحریر دراصل ایک اخباری رپورٹ ہے جو ہفتہ وار ''ہماری زبان'' علی گڑھ کے 8 مارچ 1966 کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ یہ بیدی کا لکھا ہوا مضمون نہیں، زبانی اور فی البدیہہ تقریر ہے بلکہ گفتگو کہنا زیادہ صحیح ہوگا، جسے اخباری نمائندے نے رپورٹ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ ثبوت کے طور پر اس کے بعض حصے ملاحظہ فرمایئے:

1. ''[آل احمد] سرور صاحب کی استقبالیہ تقریر کے بعد راجندر سنگھ بیدی نے حاضرین سے خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک سرور صاحب تقریر کرتے رہے میں یہی سوچتا رہا کہ اپنی تقریر کس طرح شروع کروں گا''۔

2. ''سرور صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ ''فلم سے ان کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچا ہے؟'' بیدی صاحب نے کہا کہ......'' ص-513

3. ''ذوقی صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ ''پچھلے پندرہ بیس سال میں فلم نے کیا ترقی کی ہے'' بیدی صاحب نے فلمی زندگی، فلم پروڈیوسروں کے طرز اور ان کی تاجرانہ ذہنیت کا ذکر کیا.........''

ص-514

خطوط والے حصے میں اکتیس خط شامل ہیں یہ تمام خطوط وہ ہیں جو پروفیسر قمر رئیس کے رسالے ''عصری آگہی'' کے راجندر سنگھ بیدی نمبر، میں شائع ہوئے تھے۔ وارث علوی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ تمام خطوط بیدی نے اشک کے نام لکھے تھے، ص-8۔ جب کہ اس میں ایک خط اپندر ناتھ اشک کی بیوی کوشلیا کے نام ہے اور ایک خط اپندر ناتھ اور کوشلیا کے نام مشترک ہے۔ علوی صاحب ''عرض مرتب'' میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''بیدی کے کل خطوط کی کائنات یہی ہے۔ ممکن ہے انھوں نے دوسرے لوگوں کو بھی خطوط لکھے ہوں۔ لیکن تا حال انھیں جمع کرنے اور طبع کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔'' بلاشبہ بیدی نے اشک کے علاوہ اور لوگوں کو بھی خط لکھے ہیں، معلوم نہیں انھیں یکجا کیوں نہیں کیا گیا، مشاہیر سے تو یہ بآسانی حاصل کیے جا سکتے تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور اپنے آخری زمانے میں بہت سے علمی اور ادبی کاموں کے ساتھ اپنے نام لکھے گئے مشاہیر کے خطوط بھی ترتیب دے رہے تھے۔ ان کے نام راجندر سنگھ بیدی کے بھی چونتیس خطوط تھے جن کی تاریخ وار ترتیب مکمل ہو چکی تھی۔ ان خطوں کی اشاعت کا مرحلہ سرور صاحب کی زندگی میں طے نہ ہو سکا، مرتب کے لیے یہ یا ان جیسے بیدی کے دوسرے خطوط یا ان سے متعلق معلومات حاصل کرنا مشکل نہ تھا۔

وارث علوی صاحب کی سہل پسندی کے باوجود اس اعتبار سے یہ کتاب اچھی ہے کہ اس میں بیدی کی بہت سی تحریریں ایک ساتھ جمع ہو گئیں ہیں، لیکن اس لحاظ سے تشنہ ہے کہ بیدی کے بیشتر مضامین کے سیاق و سباق، ان کی شان نزول اور صراحت ضروری تھی جس کا مرتب نے اہتمام نہیں کیا ہے۔

● اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

مصنف: محمد حسن

صفحات: 334، قیمت: 98 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: ظفر احمد نظامی، 164 ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی

پروفیسر محمد حسن ہمارے عہد کے ممتاز دانشور، ادیب، محقق اور نقاد ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن کے ذریعے انھوں نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے اور آج بھی ان کا قلم رواں دواں ہے۔ انھوں نے ادب کے میدان میں نئی جہتوں کی تلاش کو اپنا شعار بنایا ہے اور اردو دنیا کو نئے نئے موضوعات سے روشناس کرانے کی سعی کامیاب کی ہے۔

زیر نظر تصنیف، جیسا کہ اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے، ادبی سماجیات سے تعلق رکھتی ہے جو نسبتاً ایک نیا علم ہے۔ خود مصنف کے الفاظ میں ''ادبی سماجیات'' ادب کو سماج کے رشتوں سے اور سماج کو ادب کے وسیلے سے پہچاننے کی کوشش ہے۔ ادبی سماجیات ادب کا مطالعہ سماج کے وسیلۂ اظہار کے

طور پر ہی نہیں کرتی بلکہ اس کے آئینے میں عصری مسائل، اقدار حیات، بدلتے ہوئے ذوق سلیم اور ان کے محرکات کو پرکھنا اور پہچاننا بھی چاہتی ہے۔ انداز بیان اور تکنیک کے بدلتے ہوئے تصورات بھی اسی دائرے میں آتے ہیں۔''

مصنف نے اس سلسلے میں تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کو بھی مطالعے کا موضوع بناتے ہوئے ادبی سرپرستی کو ادبی ساجیات کا حصہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے موضوع کا پس منظر پیش کرتے ہوئے ادبی تاریخ کی روشنی میں ساجیات کے منزل بہ منزل اور عہد بہ عہد ارتقا کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے افلاطون، ویکو، مادام مری اسٹیل، کے علاوہ مارکس اور اینگلز کے خیالات سے بھی بحث کی ہے جنھوں نے ادب کو سماجی ارتقا کے عمل کا حصہ قرار دیا تھا۔

پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں ''ادبی ساجیات کا سب سے زیادہ وسیع اور غالباً زیادہ معروضی شعبہ ادبی ذوق کا تجزیہ، اس کے عوامل ومحرکات کا مطالعہ اور سماج پر اس کے اثرات کی نوعیت اور اس کے دائرۂ اثر کا تعین ہے۔'' انھوں نے مزید لکھا ہے کہ ''.....ادبی ساجیات پورے سماج کو ایک اکائی یا ایک فرد سمجھ کر اس کا مطالعہ کرتی ہے اور کسی دور کے اندیشوں اور ارمانوں، خواہشات اور خطرات کا اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتی ہے کہ اس دور کے بدلتے ہوئے پیٹرن، فکری اور حسی سانچے محض اتفاقی نہیں رہتے بلکہ سماجی ارتقا کے عمل کا ایک جز بن جاتے ہیں اور ادب اور سماجی ارتقا دونوں کی تفہیم میں معاون ہوتے ہیں۔''

اسی قول کی روشنی میں مصنف نے 1858 کے بعد برطانوی اقتدار کے دور کے آغاز سے حصول آزادی تک کے اردو ادب کے قلمکاروں کی حیثیت سے بحث کی ہے اور آزاد ہندوستان کے 38 شعرا 23 افسانہ نگاروں، 10 مزاح نگاروں، 22 نقادوں، 10 محققوں اور 10 مشاعرے کے شاعروں کے، خاندانی پس منظر، ان کے پیشوں اور ادبی سرپرستی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ 38 شاعروں میں سے 13 کا پیشہ تدریس، 2 کا وکالت، 3 کا ریڈیو ٹی وی، 5 کا فلم، 1 کا سرکاری ملازمت، 3 کا کاروبار اور 5 کے دیگر پیشے ہیں۔ 23 افسانہ نگاروں میں سے 3 کا پیشہ تدریس، 3 کا صحافت، 3 کا ریڈیو ٹی وی، 5 کا فلم، 1 کا سرکاری ملازمت، 3 کا کاروبار، اور 5 دیگر ہیں۔ 10 مزاح نگاروں میں سے 2 کا پیشہ تدریس، 2 کا صحافت، 4 کا سرکاری ملازمت، اور 5 کا دیگر ہیں۔

22 نقادوں میں سے 16 کا پیشہ تدریس، 1 کا ریڈیو ٹی وی، 3 کا سرکاری ملازمت اور 3 دیگر ہیں، 10 محقق میں سے 7 کا پیشہ تدریس اور 1 کا دیگر ہے۔ اس طرح 112 قلمکاروں میں سے 41 تدریس سے وابستہ ہیں، 5 صحافت سے، 2 وکالت سے، 7 ریڈیو ٹیلی ویژن سے، 7 فلم سے، 9 سرکاری ملازمت سے، 7 کاروبار سے اور 13 دیگر پیشہ جات سے وابستہ ہیں۔

سرپرستی کی اصطلاح ادبی ساجیات میں Pationage کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پہلے یہ سرپرستی سلاطین اور ان کے درباری کیا کرتے تھے لیکن آج کے جمہوری دور میں وہی ادارے ادیبوں کی سرپرستی کرتے ہیں اور انھیں ذریعۂ معاش فراہم کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اس زبان کے ادیبوں کی حد تک سرپرستی کا کیا عالم ہوگا۔ اردو میں تصنیف وتالیف عام طور پر نقصان کا سودا ہو کر رہ گئی ہے۔ سرکاری رسائل کے علاوہ کوئی پرچہ معاوضہ ادا نہیں کرتا۔ ریڈیو اور ٹی وی میں بھی مواقع محدود ہیں۔ اگرچہ ملک میں اردو اکادمیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن ان کی گرانٹ بہت کم ہے اسی لیے ان میں بیشتر فعال نہیں ہیں۔

ان قلمکاروں کی تعداد خاصی ہے جنھیں اس جائزے میں شامل کیا گیا ہے اس لیے ان میں سے ہر ایک پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ اخیر میں پروفیسر محمد حسن کے مندرجۂ ذیل اقتباس پر اس تبصرے کو ختم کیا جاتا ہے۔

''مجموعی طور پر اردو کے ادیب عدم وابستگی کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ نہ تو ارباب اقتدار کا حصہ بن کر ملک کے اندر تہذیبی اور عمرانی تبدیلیوں کا فعال اور محرک حصہ بنے ہیں کہ ان کے لیے تبدیلی کے رجز اور نئی قدروں کے نغمے گا سکیں، نہ وہ ان انقلابی طاقتوں سے خود کو ہم آہنگ پاتے ہیں جن کی نظریں مستقبل پر ہیں۔ اس عدم وابستگی میں لسانی اور تہذیبی اقلیت کے مسائل کو بھی دخل ہے اور ان سب عناصر سے مل کر ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے جو ملک کی عام فضا کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنی مخصوص پیچیدگیوں اور الجھنوں سے خالی نہیں۔''

● علاج بذریعۂ غذا

مصنف: حکیم احتشام الحق قریشی

صفحات: 512، قیمت: 90 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: عاقل زیاد، B-176، پاکٹ-1، میور وہار، دہلی-91

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو چیز آسانی سے دستیاب ہو اس کی کوئی قدر ہوتی ہے نہ قیمت۔ تاہم سچ پوچھیے تو قدرت کی تخلیق کردہ تمام چیزوں میں کچھ نہ کچھ طبی خاصیت ضرور پائی جاتی ہے جو نسل انسانی کی بقا میں مددگار ہوتی ہے۔ ہر انسان یہ سوجھ بوجھ رکھتا ہے کہ غذائیں صحت وتندرستی کے لیے کس حد

تک ضروری ہیں البتہ وہ غذا جو معمولات میں شامل ہو، محض بھوک مٹانے کے لیے ہوتی ہے۔ معمول سے ہٹ کر کسی خاص غذا کا اہتمام کیا جائے تو اس سے بھوک بھی مٹتی ہے اور جسمانی نظام میں پیدا ہونے والی ناہمواری بھی درست ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس بات کا علم کیونکر ہو کہ کون سے حالات میں کون سی غذا مفید ثابت ہوگی، مثلاً قبض کی حالت میں چاول مفید ہے یا گیہوں کے آٹے سے بنی روٹی۔ یہ طے کرنے کے لیے ہمیں ان کے طبی خواص کا علم ہونا ضروری ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''علاج بذریعۂ غذا'' جناب حکیم احتشام الحق قریشی کی تازہ ترین پیش کش ہے۔ حکیم صاحب نے علاج معالجے کے تعلق سے کئی کتابیں لکھی ہیں اور یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گھریلو نسخے پیش کیے گئے ہیں اور زبان عام فہم استعمال کی گئی ہے۔ کتاب میں غذائی مادوں کا تفصیلی بیان ہے، مثلاً کس مادے کا مزاج کیا ہے یا کس مادے میں ضروری تغذیات کیا ہیں، نیز کون سی حالت میں کس غذا کو اہمیت دی جانی چاہیے اور اسے کس طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔

مصنف نے کتاب میں معلوماتی مضامین بھی شامل کیے ہیں مثلاً علاج بذریعۂ غذا کے چند بنیادی اصول''، ''معدہ اور جگر کی عموماً مضر غذائیں''، ''مریضوں کے غذائی قوانین''، ''غذاؤں میں غذائی اجزا کا تناسب''، ''غذاؤں کے ہضم ہونے کے اوقات''، ''حفظان صحت کا غذائی نظام'' وغیرہ۔ یہ مضامین ایسے ہیں جن کا مطالعہ حفظان صحت کے تعلق سے بہت ضروری ہے۔

اس طرح کی کتابوں کے مطالعے کو اہمیت دی جانی چاہیے کیونکہ موجودہ دور کی بہت سی ایجادات نے انسان کو جہاں بہت سی سہولتیں فراہم کی ہیں وہیں بہت سے منفی اثرات بھی پیدا کیے ہیں، خاص طور پر حفظان صحت کے تعلق سے کئی مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ بہت سے مغربی ممالک میں بھی اب فطری علاج سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ اس طرح کی کتابوں کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان تعریف و تحسین کی مستحق ہے۔

● ذہن جدید سہ ماہی

مدیر: زبیر رضوی

صفحات: 232، قیمت: 40 روپے

ناشر: ذہن جدید، C-2، اے بی کامپلکس 179/8، ذاکر نگر، نئی دہلی-25

مبصر: جاوید رحمانی، AB-401/2، بدھ وہار، نئی دہلی-67

''ذہن جدید'' اردو کا ایک رجحان ساز رسالہ ہے۔ اس رسالے کا امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ بنیادی طور پر تو ادبی ہے لیکن تھیٹر، فلم اور دوسری زبانوں کے ادب سے بھی دلچسپی لیتا رہا ہے اور یہ دلچسپی سطحی قسم کی نہیں بلکہ زبیر رضوی جس توجہ اور انہماک کے ساتھ ادبی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں اسی توجہ اور انہماک سے فلم، تھیٹر، مصوری اور دوسری زبانوں کے ادبی رجحانات پر تحریریں جمع کرتے ہیں۔ ''ذہن جدید'' کا یہ پچاسواں شمارہ ہے، اس لیے اس شمارے کے ساتھ ایک کتابچہ بھی تقسیم کیا گیا ہے جس میں ''ذہن جدید'' کے مختلف شماروں پر لکھے گئے تبصرے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اس شمارے میں ''تقسیم تصادم اور ہمسائیگی'' کے عنوان سے فضیل جعفری، شمیم حنفی، صغیر افراہیم، کیرتی جین، منگلیش ڈبروال اروشی بٹالیہ، مرلی منوہر پرشاد سنگھ اور زبیر رضوی کے مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین ذہن جدید فورم دہلی کے سیمینار ''تقسیم تصادم اور ہمسائیگی: اردو ہندی کے تخلیقی ادب کے حوالے سے'' میں پڑھے گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں خصوصاً شمیم حنفی کا مضمون بہت عمدہ ہے لیکن میں ذاتی طور پر ہندو پاک کے تعلقات کی بہتری میں اردو کے رول کے مسئلے پر ڈاکٹر اطہر فاروقی کا ہم خیال ہوں اور مجھے یہ یقین ہے کہ اس میں اردو کی مداخلت سے معاملہ سدھرے گا کم اور خراب زیادہ ہوگا۔

اس شمارے کا افسانوی حصہ خاصا کمزور ہے۔ عبدالصمد کا افسانہ تو انتہائی بوگس ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ نئے افسانہ نگاروں پر یہ پابندی عائد کر دینی چاہیے کہ وہ تقسیم ہند کے فسادات پر افسانے بالکل نہ لکھیں مزید یہ کہ ان افسانہ نگاروں کو لفظوں کی حرمت کا سبق بھی پڑھانا چاہیے۔ رتن سنگھ اور حسن جمال کے افسانے بھی یونہی سے ہیں۔ اقبال متین کی افسانہ نگاری پر پروفیسر عتیق اللہ نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ نجمہ رحمانی کا مضمون بھی جوش اور اقبال کے حوالے سے اچھا ہے یہ اور اچھا ہو سکتا تھا بشرطیکہ کمپوزنگ کی غلطیاں کم ہوتیں۔ تھیٹر کے حوالے سے اس شمارے میں شاہد انور کی ڈراما نگاری پر جناب حبیب تنویر نے گفتگو کی ہے۔ اس شمارے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ''ذہن جدید'' کے سابقہ شماروں کے اداریوں کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ذہن جدید کا یہ شمارہ بھی سابقہ شماروں کی طرح بیحد اہم ہے اور ایک خاص مزاج کے قارئین کے لیے کارآمد بھی۔

تقسیم ہند کے فسادات پر ذہن جدید کی خاص توجہ رہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ بہت بڑا سانحہ تھا، لیکن اتنا بڑا بھی نہیں کہ ''ذہن جدید'' جیسا رسالہ اپنے پچاسویں شمارے کے بعد بھی تقسیم ہند اور اس سے وابستہ فسادات پر اپنے صفحے ضائع کرے۔ ابھی عبدالصمد کے جس افسانے کا ذکر آیا وہ زبیر رضوی صاحب کی اس کوشش کا عبرتناک نتیجہ ہے۔ ہمارے نئے افسانہ نگار اس قابل نہیں ہیں کہ وہ ایسے حساس مسئلے کو برت سکیں۔ چنانچہ میری درخواست ہے

کہ زبیر رضوی صاحب اب اس موضوع سے دستبردار ہو جائیں۔

● **نگاہ طائرانہ**

مصنف: مظہر امام

صفحات: 240، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی-6

مبصر: سید احمد شمیم، بیت الشرف، نزد جے۔کے۔اس کالج، پارڈیہہ، جمشید پور

مظہر امام معتبر شاعر ہیں مگر ان کی نثری نگارشات بھی علمیت کا نمونہ ہوتی ہیں۔ وہ خود کو ''نقاد'' نہیں کہتے بلکہ مفتیان ادب سے بیزار نظر آتے ہیں۔ دراصل انھیں تنقید سے نہیں نقادوں کی گروہ بندی سے الرجی ہے۔ ورنہ خود ان کے تنقیدی مضامین اپنا ایک معیار رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ متنوع اور وسیع ہے۔ اسلوب بیشتر اتنا رواں اور خوش گوار جس کا جادو قاری کو سرشار کرتا ہے۔ اخلاص، ہمدردی، توازن، احتیاط اور دیانت جو اچھی تنقید کا لازمہ ہیں مظہر امام کی تحریریں اس سے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔

''نگاہ طائرانہ'' ان کے تبصروں اور تقریظوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ان تحریروں کو شامل کیا گیا ہے جو 1951 سے 2005 کے درمیان لکھی گئی ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کی اشاعت کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تبصروں اور تقریظوں پر مشتمل بعض معتبر لکھنے والوں کے مجموعے جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں ان سے تحریک ہوئی کہ اپنی تحریروں کو بھی یکجا کر دیا جائے جن میں شاید کچھ دوستوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہو۔''

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عمدہ روش ہے۔ اس طرح قاری کئی اہم لیکن فراموش کردہ کتابوں کی بازیافت کر لیتا ہے۔ قاری کے اندر اصل کتاب کے مطالعے کا شوق بیدار ہوتا ہے اور جستجو جاگتی ہے۔

مظہر امام نے کتاب کے ابواب کی تقسیم کچھ یوں کی ہے۔

تبصرے	71
دیباچے	10
رائیں	49
کچھ اور رائیں	37
کل میزان	167

ان میں دو تین مصنفین ایسے ہیں جن کے نام مکرر آئے ہیں اس طرح 164 مصنفین کی کتابوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ مظہر امام نے احمد عظیم آبادی کے پہلے شعری مجموعے ''سازینہ'' پر یوں تبصرہ کیا ہے، ''ہر چند آپ کے کلام میں فن اور زبان کی معمولی فروگذاشتیں موجود ہیں لیکن فلسفیانہ انداز فکر اور شدت احساس کی آمیزش ان کے کلام کو باوقار بناتی ہے۔''

(ماہنامہ ''معاون'' کلکتہ، مئی 1955)

مگر احمد عظیم آبادی کو جمشید پور کے ''مزدوروں کا شاعر'' کہنا درست نہیں ہے۔ احمد عظیم آبادی کی شاعری اس زمانے میں بھی نئی اور اجنبی تھی خصوصاً ان کی نظموں کا اختتام غیر منطقی ہوا کرتا تھا اور عضویاتی اعتبار سے اپنے زمانے میں نامکمل نظر آتی تھیں جس پر نریش کمار شاد نے شاعر ممبئی میں تبصرہ کرتے ہوئے سخت اعتراض کیا تھا کہ وہ زمانہ کسی بیان کو مکمل پیش کرنے کا تھا۔ ترقی پسندوں میں اشاروں کی سمجھ ابھی نہیں آئی تھی۔

ہربنس سنگھ دوست کی مرتب کردہ انتھولوجی ''ہم امن چاہتے ہیں'' پر قدرے تفصیلی تبصرہ شامل ہے۔ اس کتاب میں امن کے موضوع پر افسانے، ڈرامے اور نظمیں اردو، ہندی، بنگلہ اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے علاوہ چند غیر ملکی زبانوں کی تخلیقات اردو ترجمے کے وسیلے سے یکجا کی گئی تھیں۔ تقریباً ہر تخلیق کار کی تصویر مع احوال اس میں شامل تھی۔ دوست کے افسانوی مجموعے میں زبان و بیان کی کمزوری کی طرف بھی مظہر امام نے اشارے کیے ہیں۔

1957 کے آتے آتے مظہر امام کی نگاہ نقد عمیق ہوتی گئی ہے چنانچہ ''رقص حیات'' پر لکھا گیا تبصرہ متوازن ہے۔ خیال رہے کہ پرویز شاہدی سے مظہر امام کے تعلقات بہت قریبی رہے ہیں۔ پھر بھی انھوں نے پرویز کی ہنگامی شاعری کو نشان زد کیا ہے البتہ اسلوب نرم ہے۔

''میرا خیال ہے کہ کہیں کہیں جمالیاتی اظہار و بیان پر موضوع کی خشکی اور کرختگی غالب آجاتی ہے اور واقعی ان کی غزل اور نظم میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ امتیاز باقی رہنا چاہیے۔''

(ماہنامہ ''سہیل'' گیا، اکتوبر 1957)

عالم خورشید کے مجموعۂ غزل ''زہر گل'' (آجکل، دہلی فروری، 1999)، سید امین اشرف کی کتاب جادۂ شب (شب خون الہ آباد، شمارہ 258، جولائی 2002) اسلم بدر کی طویل فکری مثنوی ''کن فیکون''، اختر پیامی کی طویل نظم ''تاریخ'' (سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی، شمارہ جنوری تا مارچ 2003) پر لکھے گئے تبصرے معیاری، معروضی اور جامع ہیں ان میں ان کی تنقیدی بصیرت جگمگاتی ہے اور قاری کو اصل کتاب کے مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

تبصروں کے علاوہ اس کتاب میں دس دیباچے بھی شامل ہیں ان میں آفاق احمد کے ''ٹی وی ڈرامے'' ڈاکٹر وہاب اشرفی کی ''تاریخ ادبیات عالم'' پر لکھی گئی تحریریں غیر رسمی ہیں اور کتاب کے موضوع سے مظہر امام کی واقفیت کا پتا دیتی ہیں، حسن امام درد کی شعری کتاب ''حصار درد'' پر لکھا گیا دیباچہ خاصا

تفصیلی ہے۔ اس میں ''امیر منزل'' کے ماحول کے علاوہ دربھنگہ کی ادبی ہلچل کا منظر نامہ ابھر کر سامنے آگیا ہے۔

مظہر امام نے ''شعری مجموعوں کے علاوہ افسانوی اور تنقیدی مجموعوں اور ادبی مجلوں پر بھی سنجیدہ تبصرے کیے ہیں۔ ''رائیں'' اور'' کچھ اور رائیں'' بھی سرسری نہیں ہیں، خصوصاً نئے اور کم معروف ناموں کے ساتھ خاصی ہمدردی روا رکھی ہے اور غور وفکر کے بعد اپنی آرا کا اظہار خوشگوار اسلوب میں کیا ہے۔

● **قربت کی خوشبو/ علاء الدین حیدر وارثی**

مرتب: ڈاکٹر امتیاز احمد

صفحات: 140، قیمت: 200 روپے

ناشر: جاوید حیدر وارثی، وارثی کالج، تعلیم نگر، بی بی پاکر، دربھنگا-4

مبصر: ارشاد عالم، 29 اولڈ، برہم پتر ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی-110067

''قربت کی خوشبو'' علاء الدین حیدر وارثی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''عکسِ جمال'' 2002 میں منظر عام پر آیا تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا 1985 سے کی اور دھیرے دھیرے اپنی ایک پہچان بنالی۔

''قربت کی خوشبو'' میں علاء الدین حیدر وارثی کی روحانی و عرفانی شاعری یکجا کی گئی ہے جس میں حمد اور مناجات کے علاوہ دس نعتیں، تین منظومات، چوبیس منقبت و سلام، سترہ طرحی غزلیں اور چودہ مزید غزلیات شامل ہیں۔

ابتدائی صفحات میں 9 سے 38 تک پروفیسر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر قمر جہاں، اسرار اکبر آبادی اور ڈاکٹر امتیاز احمد نے علاء الدین حیدر وارثی کی شاعری اور شخصیت سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور خود شاعر نے بھی اپنی فکر اور شاعری کی غرض و غایت بیان کی ہے۔ آخر کے صفحات 135 سے 141 میں ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر علقمہ شبلی اور ڈاکٹر اشرف حسین نے ان کی شاعری سے متعلق اپنی آرا پیش کی ہیں۔ اس مجموعے میں مرتب نے ''عکسِ جمال'' سے بھی کچھ کلام کا انتخاب شامل کیا ہے اور جواز یہ فراہم کیا ہے کہ قاری کے سامنے ان کی شاعری کا تواتر اور تسلسل قائم رہے تاکہ ان کی نگارشات پر کوئی واضح رائے دیتے ہوئے تسامح نہ ہو۔

ان کی غزلیں اور عارفانہ کلام ان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں، ان میں زندگی اور عمل دونوں کو ایک دوسرے کا آئینہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کا تخلیقی جوہر روایات کے جمالیاتی سرچشمے سے ابھرتا ہے جس میں عصریت کی لہریں موج زن ہیں۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کی شاعری ''انفرادیت کی خوشبو بھی رکھتی ہے اور عصری آفاقی دھنک کی کیفیت بھی۔'' انھوں نے تشبیہ، استعارہ اور علامت کو تخلیقی سطح پر بڑی سادگی اور پرکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں مجاز اور حقیقت باہم شیر و شکر ہیں۔

شاعر کا دل عشق و آگہی کا سرچشمہ ہے اور ان کی پوری شاعری ان کے دلی احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ □□□

نشاطِ روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاطِ روح'' (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے ''تبصرہ'' کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

رفعت سروش

سیر جم کاربیٹ ریزرو پارک کی

2007 گزر گیا۔ صبح ہوئی تو نئے سال کی مبارکبادیوں کے ساتھ یہ امر بھی دلچسپی کا باعث تھا کہ آج ہم لوگ ناشتہ کرنے کے بعد جم کاربیٹ کے لیے نکلنے والے ہیں — ہم لوگ یعنی میں، میرا بیٹا نوید، بہورُبا اور اُن کے بیٹے اور میرے پوتے عشیر اور اطیب — ہم پانچوں اس گھر یعنی 204 صبا اپارٹمنٹ میں ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن ایسا اتفاق کم ہوا ہے کہ ہم سب سیر و تفریح کے لیے ایک ساتھ نکلے ہوں کیونکہ نوید کو شوق ہے اونچے اور دور دراز پہاڑوں پر جانے کا اور میری جسمانی معذوری مجھے ایسے سفر سے باز رکھتی ہے۔ چنانچہ جب میں دہلی سے باہر کبھی جاتا ہوں تو یہ لوگ اپنے طور پر سیر و تفریح کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ مگر اس بار میں نے ارادہ کر ہی لیا کہ ان کے ساتھ جم کاربیٹ ریزرو فوریسٹ جاؤں۔ کیونکہ یہ جگہ زیادہ دور بھی نہیں ہے اور وہاں پہنچنے کے لیے پہاڑوں کی چڑھائی بھی نہیں کرنا پڑتی اور نوید تو ٹھہرے جنگل کے رسیا اور جنگلی جانوروں سے ملاقات کے شوقین۔ انھوں نے اپنے تجربات پر مبنی ایک کتاب بھی لکھی ہے — ''جنگل میری نظر میں'' — اور جنگلی جانوروں پر ڈاکیومینٹری فلمیں بھی بنائی ہیں۔

نوید کی کار میں سفر شروع ہوا، اور ہم مرادآباد اور کاشی پور ہوتے ہوئے رام نگر پہنچ گئے۔ اس علاقے میں رام گنگا بہتی ہے۔ قصبے کے نواح میں ہی ہمالہ کی ترائی میں یہ جنگل ہے جسے جم کاربیٹ ریزرو فوریسٹ کا نام دیا گیا ہے — انگریزوں کے دورِ حکومت میں جم کاربیٹ نام کا یہ شخص محکمۂ ڈاک میں ملازم تھا اور شیروں کا شکاری تھا۔ ان دنوں یہاں بہت سے آدم خور شیر تھے اور جم کاربیٹ نے سنا ہے ان گنت شیر مارے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ بعد میں اس نے شیر کے شکار سے توبہ کر لی تھی اور پھر شیروں کو بسانے کا کام بھی اس نے کیا اور اب ستر اسکوائر کیلومیٹر میں پھیلے ہوئے اس عریض و طویل جنگل کو اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

اس جنگل کے دو حصے ہیں — سڑک کے دائیں طرف غیر محفوظ جنگل ہے۔ ظاہر ہے وہاں خطرناک جانور ہوں گے۔ سڑک کے بائیں طرف کا جنگل ریزرو فوریسٹ ہے جو باقاعدہ فوریسٹ ڈپارٹمنٹ کی نگرانی میں ہے اور ان کا عملہ اس کا انتظام کرتا ہے۔

تقریباً پانچ بجے ہم لوگ ''وائلڈ ایڈونچر کیمپ'' گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے جس کے مالک للت بشٹ نوید کے پرانے دوست ہیں اور ہمارے گھر کئی بار نوئیڈا آچکے ہیں۔ ان کے اصرار پر ہی ہم نے یہاں قیام کرنے کا پروگرام بنایا تھا — یہ گیسٹ ہاؤس بہت پر فضا مقام پر ہے۔ دو ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے اور ایک چوکور میدان کے چاروں طرف دس کشادہ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ہر کمرے میں ایک ڈبل بیڈ اور ساتھ میں جدید طرز کا باتھ روم ہے۔ میدان کے بیچ میں ایک بڑی گول آرام گاہ ہے جس میں دس پندرہ کرسیاں رکھی ہیں۔ گیسٹ ہاؤس کے ایک طرف کو کچن ہے اور ڈائننگ ہال بھی ہے۔ ادھر ادھر درختوں کی قطاریں اور ان کے سائے میں پودوں کی کیاریاں، بیچ میں کھلا میدان اور گیسٹ ہاؤس کے چاروں طرف لوہے کے تاروں کی باڑھ، جس میں رات کو 12 وولٹ کا ڈی سی کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اگر کوئی جنگلی جانور اندر آنا چاہے تو ہلکے سے کرنٹ کا جھٹکا کھا کر بھاگ جائے۔ للت نے لکڑیوں کا چھوٹا سا الاؤ سلگا دیا اور اس فارسٹی ماحول میں آگ تاپنے میں بہت ہی لطف آیا اور تھوڑی دیر کو ہی سہی، محسوس ہوا کہ ہم مانس گندھ سے پاک، کھلی ہوا میں سانس لے رہے ہیں — للت اور ان کے تجارتی پارٹنر پیوش نے بہت

خوش اسلوبی اور نفاست سے اس ریزورٹ کو ترتیب دیا ہے۔ سات آٹھ آدمیوں کا اسٹاف ہے۔ کھانے کا معقول بندوبست ہے۔ للت نے ہمیں بتایا کہ دو روز قبل ہی گیسٹ ہاؤس کے باہر دن کے بارہ بجے ایک شیر ادھر آ گیا تھا اور ایک منی بس کے ڈرائیور نے انجانے میں اس کے ٹکر ماردی تھی۔ حادثے کی جگہ پر شیر کی مونچھ کے کچھ بال اور تھوڑا سا خون ملا۔ ظاہر ہے شیر تو جنگل میں بھاگ گیا مگر بس کا ڈرائیور گرفتار ہو گیا— ایسے واقعات اس علاقے میں ہوتے رہتے ہیں۔

گیسٹ ہاؤس کے ماحول سے ہم لوگ جلد ہی مانوس ہو گئے اور منتظمین کی خوش اخلاقی کے باعث ایسا لگنے لگا کہ ہم اپنے فارم ہاؤس میں پکنک منانے آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ کچھ کھانا تھا، کچھ کھانا وہاں کے کک نے بنایا اور سب نے مل کر کھانا کھایا اور دیر تک کھلے آسمان کے نیچے الاؤ کے گرد بیٹھے رات کی خاموشی کا لطف لیتے رہے۔ وہاں بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد جنریٹر چلا دیا گیا تھا، تقریباً دو تین گھنٹے کے لیے، اور پھر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے جہاں مٹی کے تیل کی پرانے طرز کی لالٹینیں جل رہی تھیں۔ للت نے کہا تھا کہ رات کو شیروں کے دہاڑنے کی آوازیں آ سکتی ہیں، مگر ہم نے اس رات کوئی آواز نہیں سنی۔ سرد رات گرم لحافوں میں آرام سے گزاری۔ صبح صبح جب سورج کا سونا جنگل میں بکھرنے لگا تو ہم بھی اپنے کمروں سے نکلے اور اس بے حد پرسکون ماحول میں چائے پینے اور ناشتہ کرنے کا کچھ اور ہی لطف تھا۔

جم کاربیٹ پارک میں داخلے کے کئی راستے ہیں۔ ایک دھن گری گیٹ ڈھکالا سے اور دوسرا ڈنڈا گیٹ بج رانی سے۔ ہم بج رانی کے بالکل قریب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہمیں دو بجے جنگل میں جانا تھا مگر داخلے کے لیے پاس پہلے سے لینے پڑتے ہیں۔ تیس روپئے فی کس کے حساب سے پرمٹ ملتا ہے۔ گیارہ بجے دفتر کھلتا ہے مگر سیاحوں کی لائن پہلے سے لگ جاتی ہے کیونکہ اندر صرف تیس بند جیپوں کے جانے کی اجازت ہے۔ بروقت ٹکٹ آ گئے اور ہم نے ایک جیپ کرائے پر لی، سات سو روپئے ایک پھیرے کا کرایہ— ساتھ ایک گائڈ بھی لینا ضروری ہے جسے دو سو روپئے دینے پڑتے ہیں۔ ہم نے ڈھائی بجے کے قریب جنگل میں قدم رکھا۔ یعنی ہماری جیپ نے (کیونکہ جنگل میں جیپ سے اترنے کی تو اجازت ہی نہیں ہے) کچھ ہرے بھرے، کچھ خزاں رسیدہ ننگے پیڑوں کے نظاروں نے میری نظر کو اسیر کرلیا۔ خاموش جنگل اور سال کے بلند قامت پیڑ— آسمان سے باتیں کرتے ہوئے— شہر کی کھچ کھچ اور شور شرابے سے دور۔ اس فضا میں عجیب سکون ملا۔ مطمح نظر تھا شیر کا دیدار— اور شیر کب اور کہاں مل جائے کیا پتہ اس لیے جنگل کے قانون کے مطابق خاموشی سے یہ سفر جاری رہتا ہے۔ ہمارے ساتھ کئی جیپیں اندر آئی تھیں، مگر سب ادھر ادھر ہو گئیں اور اپنی راہ پر ہم اکیلے ہی چل رہے تھے۔ جنگل کی ان کچی راہوں کو جو کچی بھی اس قدر ہیں کہ جیپ روانی سے چلتی ہے، گائڈ اور ڈرائیور خوب جانتے ہیں کہ کدھر کدھر کو جانا ہے۔ کہیں اونچائی، کہیں گہرائی، کہیں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بھرے پایاب نالے۔ جیپ دھیمی رفتار سے چلتی رہی۔ پھر ڈرائیور نے جیب روکی۔ ایک چتکبرا ہرن نظر آیا۔ اسے شوق سے دیکھا۔ نوید کے ہاتھوں میں ویڈیو کیمرہ تھا اور میرے بڑے پوتے عشیر کے ہاتھ میں اسٹل کیمرہ۔ دونوں نے فوٹو کھینچے اور آگے بڑھ گئے۔ چند کلومیٹر چلنے کے بعد بجرانی گیسٹ ہاؤس تھا۔ کچھ لوگ یہاں بھی قیام کرتے ہیں— آگے بڑھے۔ اب جنگل ہی جنگل، ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر— مختلف قسم کے ہرنوں کو دیکھا، مگر شیر کے درشن نہ ہوئے۔ امید پر سفر جاری رہا۔ چلتے چلتے اور راستے بدلتے بدلتے شام ہو گئی۔ ایک جگہ ہرنوں کی چوکنی کیفیت دیکھ کر امید بندھی کہ آس پاس شیر ہوگا۔ مگر— ''نہ ہوا پر نہ ہوا شیر کا دیدار نصیب''— شیر نہ ملے، ہاتھی کے دیدار تو ہوں۔ مگر— وہ کیم شیحم پیکر بھی نظر نہ آیا— چلے— اور چلے— واپس ہو رہے تھے کہ اچانک بائیں جانب سے ایک ہاتھی قدم اٹھاتا ہوا نظر آیا— چند گز کے فاصلے

پر۔ ہم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ دم بخود۔ ایک ہاتھی، پھر دوسرا ہاتھی، پھر ایک بچہ ہاتھی — شاید یہ قافلہ ہماری سڑک پر آجاتا۔ مگر ہاتھیوں نے دیکھ لیا کہ ایک جیپ کھڑی ہے اور وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف قدم اٹھانے لگے۔ ان کے پیچھے اور ہاتھی — اور ہاتھی۔ ہم اس نظارے میں محو تھے۔ میرِ کارواں ہتھنی نے دوسری طرف ذرا ٹھہر کر جائزہ لیا کہ سب آگئے یا نہیں۔ کیمرے اپنا کام کر رہے تھے کہ ہمارے پیچھے سے ایک کے بعد ایک دو جیپیں دندناتی ہوئی تیزی سے آئیں اور ان میں بیٹھے ہوئے بچے شور مچانے لگے۔ ہاتھی بے چین ہو گئے اور ایک نے دور سے ہماری طرف قدم اٹھاتے ہوئے دہاڑ ماری۔ ہمارے ساتھ چھوٹا بچہ اطیب بھی تھا — سات سال کا — وہ ڈر بھی سکتا تھا۔ ہمارے گائڈ نے ڈرائیور سے کہا: تیزی سے جیپ آگے بڑھاؤ۔ فوٹو تو ان لوگوں نے کھینچ ہی لیے ہیں۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ ذرا چلے تھے کہ بائیں طرف ایک نر ہاتھی جس کے بڑے بڑے دانت چمک رہے تھے، ایک پیڑ سے کچھ شاخیں توڑتا نظر آیا — بالکل سڑک کے کنارے — ہم رک گئے، اور جب گائیڈ نے دیکھا کہ ہاتھی پیڑ کی شاخوں کو توڑ رہا ہے تو اس نے کہا — خاموشی سے جیپ آگے بڑھاؤ۔ جیپ آگے بڑھی، اس کے پاس سے گزری، ہاتھی نے پیڑ کی شاخ وہیں چھوڑی اور الٹے پاؤں جنگل میں اندر کی طرف چل پڑا۔ ذرا دور جا کر چلّایا — مگر اس کا رُخ جنگل میں اندر کی طرف تھا اور ہماری جیپ اپنے راستے پر تیزی سے چل پڑی تھی۔ پھر آگے ایک ہاتھی اور نظر آیا۔ وہ ہم سے دور جنگل میں تھا اور ہماری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ ہم نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ہم نے ان نظاروں کو ہی غنیمت جانا اور اپنی راہ لی — راستے میں ہرن ملے، کچھ خوبصورت پرندے اور ایک جگہ لنگوروں کا غول پیڑوں پر اچھل کود کرتا ہوا — سورج ڈوبنے لگا۔ شیر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اور ہم جنگل کے اس راجہ کو سلام کیے بغیر ہی واپس آگئے۔ جنگل، خاموشی، تازگی، ہاتھیوں کے جھنڈ کی چہل قدمی اور ہرنوں کی کلیلیں اپنے ذہن میں سمیٹے ہوئے — اور پھر وہی رات تھی اور ہمارا گیسٹ ہاؤس — واپسی میں ایک دو جیپیں ملیں۔ ایک دوسرے کا حال پوچھا، تو ایک جیپ کے مسافروں نے کہا۔ ہمیں نہ شیر نظر آیا، نہ کوئی ہاتھی۔ بہرحال جنگل میں گھومنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا اور طبیعت نے فرحت محسوس کی۔

اگلی صبح نوید اور بچے پھر شیر کے دیدار کی امید میں نکلے۔ راقم الحروف تو شدید سردی کے باعث لحاف سے نکلا ہی نہیں۔

نو بجے یہ لوگ صبح صبح کی سیر کر کے جنگل سے واپس آگئے۔ شیر کا دیدار نہیں ہوا۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی اور آج سردی بھی کچھ کم تھی۔ ناشتہ کیا گیا۔ اس کے بعد ایک دلچسپ شخص شمشاد خاں سے ملاقات ہوئی۔ وہ فوریسٹ ڈپارٹمنٹ میں ایک مہاوت ہے اور جنگلی جانوروں کی آوازیں نکالنے کا ماہر۔ اس نے طرح طرح کی آوازیں سنائیں اور ایک دلچسپ راز بتایا کہ ایک بار اس نے شیرنی کی آواز کئی بار نکالی — میٹنگ کال — جب شیرنی اپنے جیون ساتھی کو آواز دیتی ہے۔ شمشاد خاں نے کئی بار یہ آواز نکالی اور شیر نہ جانے کہاں سے پھلانگتا اس آوز پر دوڑ آیا۔ مگر وہاں ملا شمشاد خاں۔ شیر بپھر گیا۔ اگر شمشاد خاں اونچے درخت پر نہ چڑھ جاتا تو شیر نے غصے میں اس کا کام تمام کر دیا ہوتا۔ شمشاد خاں نے ایک ہاتھی بھی پال رکھا ہے اور اس کے آٹھ دس سال کے بچے ہاتھی کی سواری کرتے ہیں۔ اسے جنگل میں ٹہلانے لے جاتے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس کے احاطے میں اس پالتو ہاتھی کے ساتھ عشیر اور اطیب بھی کھیلے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے پھل کھلائے اور اطیب نے تو سواری بھی کی۔

للت بشٹ کے ریزورٹ میں دو دن گزار کر ہم لوگ دوپہر 3 جنوری کو ان سے رخصت ہوئے اور جم کاربیٹ پارک کی خوشگوار یادیں لیے ہوئے واپس چل پڑے۔

□□□

204, Saba Apartment, D-3, Sector-44, Noida-201301 (U.P.)

عبدالعلیم قدوائی

شارک مچھلیاں — ایک دلچسپ سمندری مخلوق

شارک کا نام سنتے ہی بہت سے لوگوں کے دل خوف سے دھڑکنے لگتے ہیں۔ مگر اس سمندری مخلوق کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ شارک مچھلیاں دنیا کے سمندروں میں ساڑھے چار سوملین سال سے موجود ہیں، ان کی 375 مختلف قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں اور تحقیقات کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ ''شارک'' لفظ ایک جرمن لفظ Schurke سے نکلا ہے جس کے معنی بدمعاش یا لالچی دھوکے باز کے ہیں۔ شروع شروع میں بحری ملاح یہ لفظ دھوکے بازوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ عام مچھلیوں کے برخلاف جن کے ڈھانچے ہڈیوں سے بنے ہوتے ہیں۔ شارک مچھلی کا جسم ایک سخت اور مڑ جانے والے مادّے کا بنا ہوتا ہے جسے کارٹیلیج Cartilage کہا جاتا ہے۔ یہی لچکیلا مادہ انسانی کان اور ناک کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔ یہ مادہ آسانی سے مڑ جاتا ہے اور اس کا وزن بھی ہلکا ہوتا ہے جس کی وجہ سے شارک مچھلیاں بہت آسانی سے تیر سکتی ہیں، بہت جلدی الٹ پلٹ جاتی ہیں اور اپنے شکار پر حملے کے دوران جب اور جدھر چاہیں مڑ جاتی ہیں۔ زیادہ تر مچھلیوں کے بدن میں ہوا کا ایک تھیلہ جسے تیرنے کا بلاڈر کہتے ہیں، ہوتا ہے، جس کی مدد سے وہ تیرنے میں چاق و چوبند رہتی ہیں۔ لیکن شارک مچھلیوں میں اس کے بجائے ان کے جگر میں تیل کا ذخیرہ ہوتا ہے جو پانی سے ہلکا ہوتا ہے اور اس وجہ سے ان کو تیرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

اللہ نے شارک کا جسم بھی خوب بنایا ہے، اس کے منھ میں بے شمار دانت موجود ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کا پورا جسم چھوٹے چھوٹے دانتوں سے مشابہ پٹیوں سے ڈھکا ہوتا ہے جنھیں ڈینٹیکلس Denticles کہا جاتا ہے۔ اگر تم اس کا جلد چھوؤ تو ایک طرف وہ چکنی محسوس ہوتی ہے مگر اس کے مخالف سمت رگڑنے سے وہ ریگ مال کی طرح کھردری لگے گی۔

سمندر میں شارک مچھلی کو سب سے خطرناک اور کامیاب شکاری مانا جاتا ہے۔ شکار کے وقت وہ اپنے تمام احساسات سے کام لیتی ہیں اور ان کو کوئی روک نہیں سکتا۔ شارک کسی بھی زخمی یا بیمار جاندار کی بو ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے سے سونگھ لیتی ہے اور اسی بو کی سیدھ میں تیرنے لگتی ہے۔ اس کے پاس ایک خاص طرح کی لمس (چھونے) کی طاقت ہوتی ہے اور وہ اپنے بدن پر پڑی ہوئی پٹیوں سے پانی کے اندر نقل و حرکت اور سمت کا تعین آسانی سے کر لیتی ہے۔ شکار کے وقت آنکھوں کی حفاظت کے لیے کچھ شارک مچھلیاں، مثلاً گریٹ وہائٹ، اپنی آنکھوں کو اپنے سر کے اندر گھسیڑ لیتی ہیں اور کچھ شارک مچھلیوں کی آنکھوں پر ایک پتلا پردہ ہوتا ہے جو حملے کے وقت ان کی آنکھوں پر پڑ جاتا ہے۔ شلوک کا جسم ایک مڑ جانے والی اور آسانی سے گھوم جانے والی تارپیڈو کشتی سے مشابہ ہوتا ہے اس لیے وہ بہت تیزی اور آسانی سے تیر کر اپنے شکار کو پا لیتی ہے۔ شکار کی کسی متعین جگہ پر موجودگی کا احساس شارک اپنے Electro Sense سے کرتی ہے۔ اس کے اوپری حصۂ جسم میں چھوٹے چھوٹے مسامات ہوتے ہیں جو ہر زندہ مخلوق کے جسم سے نکلنے والی برقی لہروں کو پکڑ لیتے ہیں اور ان کی مدد سے شارک اپنے شکار کا پتہ لگا لیتی ہے۔ اپنی نسل بڑھانے اور کھانے کی تلاش میں کچھ شارک مچھلیاں ہر سال ہزاروں کیلومیٹر کا سفر کرتی ہیں اور سائنس دانوں کے قیاس کے بموجب یہ راستے اور جہت کا تعین اپنے الیکٹرو سنس سے کرتی ہیں۔ ان کی خوراک زیادہ تر چھوٹی مچھلیوں، جھینگوں، کیکڑوں اور سمندر کے اندر پیدا ہونے والی دوسری مخلوقات پر مشتمل ہوتی ہے۔ بڑی شارک مچھلیاں مثلاً گریٹ وہائٹ اور بل شارک سمندری دودھ پلانے والے جانوروں کے شکار پر گزر کرتی

ہیں۔شارک مچھلیوں کے دانت بے شمار ہوتے ہیں اور کھاتے وقت ان کے چند دانت ٹوٹ کر گر جاتے ہیں مگر ان کی جگہ دانتوں کی پچھلی قطاروں سے فوراً پُر ہو جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر شارک مچھلی تقریباً بیس ہزار دانت اپنی زندگی میں استعمال کرتی ہے۔ شارک کے جبڑے بھی حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ وہ اوپر اور نیچے کے جبڑے ہر طرف آزادی سے استعمال کرتی ہے اور اپنے منھ کو خوب اچھی طرح سے کھول سکتی ہے اور شکار کے پھنستے ہی طاقتور جبڑوں کو بند کر لیتی ہے۔

375 قسم کی مختلف النوع شارک مچھلیوں کی جسامت اور خصوصیات الگ الگ ہوتی ہیں سب سے بڑی شارک جسے وہیل شارک کہتے ہیں 15 میٹر لمبی ہوتی ہے اور سب سے چھوٹی بونی شارک 15 سینٹی میٹر سے کم لمبی ہوتی ہے جسے آپ آسانی سے ہتھیلی پر رکھ سکتے ہیں۔ کچھ شارک مچھلیوں کے جسم پر دھاریاں یا داغ پائے جاتے ہیں، کچھ چپٹی ہوتی ہیں اور کچھ گول۔ بعض شارک مچھلیاں پانی کے اندر چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بعض مچھلیوں کے سر عجیب طرح کے T کی شکل کے یا ہتھوڑے کی شکل کے ہوتے ہیں ان کی آنکھیں ان کے چپٹے سر کے دائیں یا بائیں طرف ہوتی ہیں جن سے ان کو دیکھنے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ حال ہی میں شارٹ فن ماکو شارک دریافت ہوئی جو 48 کیلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے تیر سکتی ہے۔ ایک طرح کی شارک مچھلی کے جسم میں دو دھاردار سینگ بھی ہوتے ہیں۔ یہ ایک میٹر لمبی ہوتی ہے اور کیلی فورنیا اور میکسیکو کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ کچھ شارک مچھلیوں کے جسم پر کالی اور بھوری دھاریاں پڑی ہوتی ہیں ان کو لیوپارڈ شارک کہا جاتا ہے۔

سب سے بڑی یا دیوزاد شارک وہیل ہوتی ہے اور اسی کے مقابل دوسری زبردست شارک گریٹ وہائٹ ہوتی ہے۔ وہیل شارک کی لمبائی 15 میٹر اور وزن 13 ٹن سے بھی زیادہ ہوتا ہے، یہ خط استوا کے قریب سمندروں کے گرم پانی میں پائی جاتی ہے۔ اس کے منھ میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے دانت ہوتے ہیں جو چھ سائز میں چاول کے دانے کے برابر ہوتے ہیں۔ گریٹ وہائٹ یا سفید موت چھ میٹر لمبی ہوتی ہے اور وزن 2 ٹن سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ٹھنڈے پانی والے سمندر میں پائی جاتی ہے۔

شارک مچھلیاں انسانوں پر شاذ و نادر ہی حملہ کرتی ہیں۔ ہر سال تقریباً پچاس ایسے واقعات ہوتے ہی جن میں دو تین انسانی جانیں جاتی ہیں۔ کبھی کبھی شارک غوطہ خور ماحول کے بھیگے لباس سے دھوکا کھا کر اور انھیں سیل یا سمندری کیکڑہ سمجھ کر ان پر حملہ کر دیتی ہیں۔

ہر سال انسان تقریباً 200 ملین شارک مچھلیوں کو یعنی دو لاکھ بہتر ہزار مچھلیوں کو مار ڈالتے ہیں۔ یہ شکار ان کے گوشت، کھال، تیل اور دانت حاصل کرنے کے لیے یا محض تفریح کی خاطر کیا جاتا ہے۔ ان کے جبڑوں کو علاحدہ کر کے یادگار اور نایاب چیزوں کی طرح اونچی قیمت پر بیچا جاتا ہے۔

اگر اتفاق سے کوئی شارک کسی انسان پر حملہ کر دے تو اسے چاہیے کہ وہ شارک کی طرف نہ تیرے اور ہوش و حواس کو قائم رکھتے ہوئے اپنی کشتی یا ساحل کی طرف جانے کی کوشش کرے۔ سمندر میں یوں بھی اکیلا تیرنا خلاف احتیاط ہے، گھبراہٹ میں شور و غل مچانے یا پانی کو چھپھپانے سے شارک کے حملے کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔

اگر شارک مچھلیوں کے شکار کا سلسلہ قائم رہا تو وہ دن دور نہیں جب یہ عجیب اور دلچسپ سمندری مخلوق دنیا سے بالکل غائب ہو جائے گی۔ شارک مچھلیاں دوسری مچھلیوں کی آبادی پر قابو رکھتی ہیں اور سمندروں کو صاف رکھتی ہیں۔ کیا ہم یہ نقصان برداشت کرنے کو تیار ہیں۔

□□□

Zahida Manzil, 41873, New Friends Colony, Aligarh-202002

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اوّل)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

''بحر الفصاحت''، نظم و نثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت -/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت 1-/52 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں ''آتش پارے''، ''منٹو کے افسانے'' اور ''دھواں'' کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ''کلیات علی سردار جعفری'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر'' اور ''امن کا ستارہ'' اور دوسری جلد میں ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر''، ''لہو پکارتا ہے'' اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اوّل صفحات: 496، قیمت -/164 روپے، جلد دوم: صفحات: 533، قیمت -/200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رووں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ ''کلیات حسن نعیم'' میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم ''کوشش'' کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم ''ہیپی نیس آف اس الون'' پر مبنی ہے، جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت -/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیرئیر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ ''میرے اپنے'' مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم ''اپن جن'' کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت -/63 روپے

Date of Publication : 24/07/2008
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, August 2008, Vol. 10, Issue: 8
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
چین	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
[illegible]	[illegible]	174 روپے	236 روپے	306 روپے
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	398 روپے

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and
printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938